بسم اللہ الرحمن الرحیم

امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ

فقہی و سیاسی کردار

ابو عمار
زاہد الراشدی

الشریعہ اکادمی
گوجرانوالہ، پاکستان
www.alsharia.org

جملہ حقوق محفوظ!

عنوان : امام اعظم ابوحنیفہؒ فقہی وسیاسی کردار
تالیف : ابوعمار زاہد الراشدی
مرتب : ناصر الدین عامر
نظر ثانی : عمار خان ناصر
ناشر : الشریعہ اکادمی، ہاشمی کالونی، گوجرانوالہ
اشاعت : اگست ۲۰۲۳ء

فہرس

پیش لفظ ۷

☆ امام ابوحنیفہؒ کا فقہی وسیاسی ذوق ۸

امام ابوحنیفہؒ سے نسبت ۸

اجتماعی وشورائی فقہ ۹

امام صاحبؒ کا سیاسی ذوق ۹

حکمرانوں کے خلافِ شرع کاموں کی نشاندہی ۱۰

امت کو مشکل مراحل سے نکالنا ۱۱

اہل کوفہ، امام ابوحنیفہؒ کے موالی ۱۳

امام صاحبؒ کا سیاسی کردار ۱۳

نظامِ ظلم کا حصہ بننے سے انکار ۱۴

☆ اسلامی قانون سازی میں امام ابوحنیفہؒ کا اسلوب ۱۵

امام ابوحنیفہؒ کا قاضی القضاۃ کا منصب قبول نہ کرنا ۱۵

(۱) اسلامی قانون سازی ۱۷

- فقہ حنفی کی مقبولیت وعروج کی وجہ ۱۸

- امام صاحبؒ کی قانون ساز مجلس کا ماحول ۱۹

(۲) حکومتی مناصب کے لیے افراد سازی ۲۰

- نفاذِ اسلام کا مطالبہ اور اس کے تقاضے ۲۱
امام ابو یوسفؒ کا قاضی القضاۃ کا منصب قبول کر لینا ۲۱
آج کا دور اور امام ابوحنیفہؒ کی حکمت عملی ۲۳
- اصلاحِ نظام کی تحریکات کی سرپرستی ۲۴
- گوڈ گورننس کے قیام کے لیے راہنمائی ۲۴
- علمی دنیا میں اجتماعی مشاورت کا اہتمام ۲۵
☆ عصرِ حاضر میں امام ابوحنیفہؒ کے طرزِ فکر کی اہمیت ۲۶
عصرِ حاضر اور تین اہم اسلامی شخصیات ۲۶
حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کا طرز حکومت ۲۶
فقہ حنفی، ایک ہمہ گیر فقہ ۲۹
امام ابوحنیفہؒ اور دینی تعلیم وتربیت ۳۰
امام صاحبؒ کا اصولِ استدلال ۳۲
وحی الٰہی کی روشنی میں عقل کا استعمال ۳۲
فقہ حنفی کی مقبولیت کی وجہ ۳۳
گفتگو کا خلاصہ ۳۴
☆ امام اعظمؒ کی تعلیمات اور عصر حاضر ۳۵
امام اعظمؒ نے قاضی القضاۃ کا منصب کیوں قبول نہیں کیا؟ ۳۶
- امام اعظمؒ کی توجہ کا سبب ۳۶
- ایک مدون ذخیرۂ قوانین کی ضرورت ۳۷
- نفاذ وعملداری کے لیے رجال کار کی ضرورت ۳۸
- پاکستان میں نفاذِ اسلام کے لیے رجال سازی ۴۰
امام اعظمؒ آج کے حالات میں کیا کرتے؟ ۴۱
(۱) دینی تحریکات کی سرپرستی ۴۲
(۲) اجتماعی مشاورت کا نظم ۴۲

(۳) بدعنوانی سے پاک معاشرہ ۴۴
☆ امام ابوحنیفہؒ اور عقائد وتعبیراتِ اہل سنت ۴۵
امام اعظمؒ عقائد وتعبیرات میں بھی امام ہیں ۴۵
فکری واخلاقی تربیت ۴۶
عقل پرستی اور ظاہر پرستی ۴۷
فقہ حنفی، ایک متوازن فقہ ۴۸
☆ محدثین اور فقہاء کا منہجِ عمل اور فقہ حنفی ۵۰
محدثین اور فقہاء کی محنت ۵۰
ائمہ اربعہ کی مقبولیت اور فقہ حنفی کا امتیاز ۵۲
☆ فقہ حنفی کی امتیازی خصوصیات ۵۵
عالم اسلام کی پہلی مدون فقہ ۵۵
شورائی فقہ ۵۷
روایت ودرایت میں توازن ۶۰
فقہ حنفی کے عروج کی وجہ ۶۱
☆ ہم حنفی کیوں کہلاتے ہیں؟ ۶۲
اتباع کے لیے نمونہ افراد ۶۲
تقلید کے لیے پیشوا کا انتخاب ۶۴
اتباع کے لیے امام ابوحنیفہؒ ہی کیوں؟ ۶۶
- عقل کا جائز مقام ۶۷
- شورائی فقہ ۶۷
- قابل عمل فقہ ۶۸
☆ فقہ حنفی اور اس کی مقبولیت ۶۹

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ امت مسلمہ کی ان عظیم علمی شخصیات میں سے ہیں جن سے امت نے ہر دور میں استفادہ کیا ہے اور ان کے علوم و فیوض رہتی دنیا تک اہل علم و دانش کی راہنمائی کا ذریعہ بنتے رہیں گے۔ مجھے بھی ایک طالب علم کے طور پر امام صاحبؒ سے استفادہ اور ان کے بارے میں مختلف حوالوں سے گفتگو کا موقع ملتا رہتا ہے جو میرے لیے فیض و برکت کے ساتھ ساتھ اعزاز کی بات بھی ہے۔ اس سلسلہ میں چند نشستوں میں کی گئی گفتگو زیر نظر مجموعہ کی صورت میں قارئین کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ دعا ہے کہ اللہ رب العزت اس کاوش کو ہم سب کے لیے سعادتِ دارین کا ذریعہ بنائیں، آمین یارب العالمین۔

ابوعمار زاہد الراشدی
ڈائریکٹر الشریعہ اکادمی، گوجرانوالہ
۱۲ جون ۲۰۲۳ء

امام ابوحنیفہؒ کا فقہی وسیاسی ذوق

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی سید المرسلین وعلی آلہ واصحابہ واتباعہ اجمعین. اما بعد.

امام ابوحنیفہؒ سے نسبت

آج ہم عالم اِسلام کی ایک عظیم شخصیت حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کی نسبت سے جمع ہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ یہ نسبت ہمارے لیے اصل سرمایہ ہے۔ اپنے بڑوں، بزرگوں اور اکابر کے ساتھ درجہ بہ درجہ ہماری نسبتیں ہی ہمارا اَثاثہ ہیں۔ میں اس بات کو بجلی کے کنکشن سے تعبیر کیا کرتا ہوں۔ ایک کنکشن قائم ہو تو کچھ نہ کچھ ملتا ہی رہتا ہے۔ لوڈ شیڈنگ ہو تب بھی کام چلتا رہتا ہے۔ لیکن اگر کنکشن کٹ جائے تو کچھ بھی ملنے کی امید نہیں رہتی۔ تو یہ دراَصل دین کے مراکز کے ساتھ اور دین کی بڑی شخصیات کے ساتھ ہمارے کنکشنز ہیں جو ہمیں اپنے نظریہ و مقصد سے جوڑے ہوئے ہیں۔ پھر حضرت امام ابوحنیفہؒ کی نسبت تو اتنی بڑی نسبت ہے کہ اِس پر جس قدر فخر کیا جائے کم ہے۔ حضرت امام صاحبؒ کی حیات پر، آپؒ کی جدوجہد پر اور آپؒ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر آپ حضرات نے اِس نشست میں متعدد علمائے کرام کے ارشادات سنے ہیں اور میری گفتگو کے بعد مزید علماء کے ارشادات سنیں گے۔

مجھ سے یہ کہا گیا ہے کہ اِمام صاحبؒ کی زندگی کے سیاسی پہلوؤں پر بات کروں۔ یہ ایک مستقل اور لمبی گفتگو کا موضوع ہے۔ لیکن میں اِس وقت صرف دو باتیں عرض کرنا چاہوں گا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میرے نزدیک حضرت امام ابوحنیفہؒ کی جدوجہد کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ انہوں نے علمی دنیا کو، افتاء کی دنیا کو، استنباط کی دنیا کو اور فتویٰ و رائے کی دنیا کو مشاورت اور اجتماعیت کا رنگ دیا۔ استنباط اور اجتہاد امام صاحبؒ سے پہلے بھی ہوتے رہے ہیں اور بعد میں بھی۔ اور یہ اپنے دائرے میں قیامت تک ہوتے رہیں گے۔ لیکن جس

شخصیت نے اجتہاد واستنباط کو اجتماعیت کی شخصیت دی اور امت مسلمہ کی اجتماعی رہنمائی کا راستہ دنیا کے سامنے پیش کیا، وہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کی شخصیت ہے۔

اجتماعی وشورائی فقہ

میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کی فقہ کو شخصی فقہ نہیں سمجھتا۔ آپ حضرات میری اس بات سے اتفاق یا اختلاف کا حق رکھتے ہیں' اس لیے کہ جب میں خود اختلاف کا حق رکھتا ہوں تو اختلاف کا حق دیتا بھی ہوں۔ باقی مذاہب کی فقہ شخصی ہیں اور اُن کے شخصی فقہ ہونے پر کوئی اعتراض بھی نہیں ہے۔ لیکن امام ابوحنیفہؒ کی فقہ اجتماعی اور شورائی فقہ ہے۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں اور تلامذہ کے ساتھ بیٹھ کر بحث ومباحثہ کیا۔ امام صاحبؒ نے استنباط، اختلاف، استدلال اور اجتماعی مشاورت کا طریقہ اختیار کیا۔ فقہ حنفی وغیر حنفی کی جو روایات ہمارے سامنے ہیں، جن کی بنیاد پر ہم فتویٰ دیتے ہیں، وہ ایک اجتماعی مشاورتی عمل کا نتیجہ ہیں۔ یہ فقہ حنفی کا سب سے بڑا اِمتیاز ہے۔ قانون سازی، استنباط، احکام کی تعبیر وتشریح اور احکام کا اُخذ، امام صاحبؒ نے اس میں اجتماعیت کی بنیاد ڈالی۔ فقہ اور اجتہاد میں حضرت امام ابوحنیفہؒ نے اجتماعیت اور شورائیت کو فروغ دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ امام صاحبؒ کے اس ذوق کی پیروی ہی آج کی ہماری سب سے بڑی ضرورت ہے کہ ہمارے علمی فیصلوں میں مشاورت، اجتماعیت، استدلال اور مباحثے کا پہلو اجاگر ہو۔ امام صاحبؒ نے اُس وقت کے مسائل سامنے رکھ کر جس طرح استنباط واستدلال کیا اور امت کے سامنے ایک اجتماعی فقہ پیش کی، آج بھی ضرورت ہے کہ ہم اُن اصولوں کے دائرے میں رہتے ہوئے باہمی مشاورت کا اہتمام کریں اور علمی دنیا میں اجتماعیت کا ذوق بیدار کریں۔

امام صاحبؒ کا سیاسی ذوق

امام صاحبؒ کے بارے میں سیاست کے حوالے سے بہت سی باتیں عام طور پر کی جاتی ہیں۔ اِس وقت لمبی گفتگو کا موقع نہیں ہے۔ میں آپ حضرات کو امام صاحبؒ کے سیاسی ذوق سے متعارف کرانے کے لیے اُن کی تین گرفتاریوں کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ اِس سے زیادہ کا وقت شاید اِس نشست میں ہمارے پاس نہیں ہے۔

امام صاحبؒ کی زندگی میں تین گرفتاریوں کے مراحل پیش آئے ہیں۔ یہ تھوڑے تھوڑے عرصے کی تھیں لیکن بہرحال امام صاحبؒ اس سے گزرے ہیں۔ میں اِس وقت پس منظر اور تفصیلات میں جائے بغیر امام صاحبؒ کے ذوق کی ایک جھلک آپ کے سامنے پیش کرنا چاہوں گا۔ یہ واقعہ کوفہ کے گورنر خالد کے بارے میں ہے جو بنواُمیہ کے دور کا ایک گورنر تھا۔ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے اسے نقل کیا ہے۔

حکمرانوں کے خلافِ شرع کاموں کی نشاندہی

ایک دفعہ اِمام صاحبؒ جمعہ کے لیے تشریف لائے۔ خالد صاحب نے جمعہ کا خطبہ شروع کرنے کے بجائے ممبر پر بیٹھ کر سرکاری دستاویزات کا مطالعہ شروع کر دیا۔ بیٹھے جمعہ کے ممبر پر ہیں اور پڑھ رہے ہیں سرکاری دستاویزات۔ اور اتنی دیر تک پڑھتے رہے کہ عصر کا وقت داخل ہونے لگا، اور وہ بھی اِمام صاحبؒ والا مثل ثانی عصر کا وقت۔ راوی کہتا ہے کہ ایک صاحب کنکریاں ہاتھ میں لیے بڑی تیزی سے آگے بڑھے اور گورنر صاحب کی طرف رخ کر کے پھینکتے جا رہے ہیں اور کہتے جا رہے ہیں کہ خدا کے بندے ایک نماز کا وقت نکل رہا ہے اور دوسری نماز کا وقت داخل ہو رہا ہے، یہ تم کیا کر رہے ہو۔ یہ شور سن کر خالد صاحب نے نماز تو پڑھا دی لیکن ساتھ ہی پولیس کو اشارہ کیا کہ اس آدمی کو پکڑ لو۔ تو یہ آدمی امام صاحب تھے اور یہ ان کی پہلی گرفتاری تھی۔ امام صاحب کو گورنر کے سامنے پیش کیا گیا۔ گورنر نے پوچھا کہ بھئی میرے خطبے میں یہ سرِ عام حرکت تم نے کیوں کی۔ اِمام صاحب نے اس پر قرآن مجید کی آیت پڑھی:

فَخَلَفَ مِن بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا. (مریم ۵۹)

پھر ان کی جگہ ایسے نا خلف آئے جنہوں نے نماز ضائع کی اور خواہشوں کے پیچھے پڑ گئے، پھر عن قریب گمراہی کی سزا پائیں گے۔

امام صاحبؒ نے گورنر سے فرمایا کہ نماز کا وقت پر پڑھنا تمہاری سرکاری کاروائی سے مقدم ہے اور تم اِس اضاعوا الصلوۃ کے زمرے میں جا رہے تھے، جبکہ میں نے تمہیں اس زمرے میں جانے سے روکا ہے اور تمہیں توجہ دلائی ہے کہ وقت پر نماز پڑھ لو۔ گورنر نے پوچھا، کیا اس کے سوا

تمہارا اور کوئی مقصد نہیں تھا؟ امام صاحبؒ نے جواب دیا، خدا کی قسم میرا اور کوئی مقصد نہیں تھا۔ گورنر نے کہا، ٹھیک ہے جاؤ۔

چنانچہ امام صاحبؒ کا ذوق یہ تھا کہ حکمران یا بڑے لوگ اگر دین کے کسی حکم کی خلاف ورزی کی طرف بڑھ رہے ہوں تو ان کے اس کام کی نشاندہی کرنا، ان پر صدائے احتجاج بلند کرنا، انہیں آگے بڑھنے سے روکنا اور صحیح راستے کی طرف ان کی توجہ دلانی۔ چنانچہ یہ بھی حنفیت کا ایک پہلو ہے۔

امت کو مشکل مراحل سے نکالنا

ایک اور واقعہ ذکر کرتا ہوں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب خارجیوں نے مختلف شہروں پر قبضے شروع کر رکھے تھے۔ خارجیوں کا اس زمانے میں جو تعارف تھا وہ قراء کا تھا، اور وہ قاری کہلاتے تھے۔ اس لیے بصرے پر خارجیوں کے قبضے کو قاریوں کا قبضہ کہا جاتا تھا کہ بصرہ پر قاریوں کا قبضہ ہو گیا ہے۔ یہ لوگ بہت زیادہ قرآن پڑھتے تھے اور نفل بھی بہت پڑھتے تھے۔ انہوں نے جب بصرہ پر قبضہ کیا اور حکومت چھینی تو روایات میں آتا ہے کہ چھ ہزار کے قریب افراد کو انہوں نے شہید کیا۔ بعض روایات کے مطابق ان میں صحابہ بھی شامل تھے، تابعین تو بہرحال تھے ہی۔ بصرہ کے بعد کوفہ پر قبضہ ہوا۔

ضحاک ایک بڑا خارجی کمانڈر تھا۔ اس زمانے میں کوفے کے گورنر تھے عبداللہ بن عمر بن عبد العزیزؒ۔ اُن سے ضحاک کی کمانڈ میں خارجیوں نے جنگ لڑی اور شکست دے کر کوفہ پر قبضہ کر لیا۔ قبضہ کرنے کے بعد ضحاک کوفہ کی جامع مسجد میں آ کر بیٹھ گیا اور ہزاروں خارجی اس کے اردگرد تلواریں لے کر کھڑے ہو گئے۔ خارجیوں کے نزدیک کبیرہ گناہ کا مرتکب کافر ہوتا تھا۔ ضحاک نے اعلان کروایا کہ کوفہ کی ساری آبادی مرتد ہو گئی ہے، اس لیے سب باری باری میرے سامنے آ کر توبہ کریں، اور جو توبہ کرے گا اسے معافی مل جائے گی، اور جو نہیں کرے گا اسے قتل کر دیا جائے گا۔ ضحاک کے کارندوں نے اسے امام ابوحنیفہؒ کے متعلق بتایا کہ یہ یہاں کا بڑا شیخ ہے، یہ اگر مان گیا تو کوفہ کے باقی لوگ بھی مان جائیں گے، لیکن اگر یہ اڑ گیا تو باقیوں کے ماننے کی توقع بہت کم ہے۔

چنانچہ امام صاحبؒ کو گرفتار کر کے کوفہ کی جامع مسجد میں ضحاک کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ ضحاک نے امام صاحبؒ سے کہا تب من الکفر شیخ کفر سے توبہ کرو۔ امام صاحبؒ نے جواب دیا

انا تائب عن کل کفر، میری ہر کفر سے توبہ۔ضحاک اس معاملے میں موٹے دماغ کا آدمی تھا، اس نے کہا ٹھیک ہے جاؤ۔امام صاحبؒ دروازے تک پہنچے تو کسی نے ضحاک کو بتایا کہ امام صاحبؒ تو دراصل تمہارے کفر سے توبہ کر کے گئے ہیں۔ضحاک نے امام صاحب کو بلا کر پھر سامنے کھڑا کر دیا اور وضاحت طلب کی کہ شیخ تم نے کس کفر سے توبہ کی ہے۔ضحاک نے مزید کہا کہ شیخ ہمارے خیال میں تم نے ہمیں کافر کہہ کر ہمارے کفر سے توبہ کی ہے۔امام صاحبؒ نے پوچھا، یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ میں نے تمہارے کفر سے توبہ کی ہے، ایسا سمجھنا تمہارا گمان ہے یا یقین؟ ضحاک نے کہا کہ یہ میرا گمان ہے کہ تم نے ہمارے کفر سے توبہ کی ہے۔امام صاحبؒ نے قرآن مجید کی آیت کا ایک جملہ پڑھا ان بعض الظن اثم ، اور پھر ضحاک سے کہا کہ قرآن مجید کے مطابق اپنے عقیدہ کی رُو سے تم خود کافر ہو گئے ہو، اس لیے پہلے تم توبہ کرو۔ضحاک نے بوکھلا کر کہا، اوہو، غلطی ہو گئی۔ٹھیک ہے میں توبہ کرتا ہوں۔پھر کہا میں نے توبہ کر لی، اب تم بھی توبہ کرو۔امام صاحب نے پھر کہا انا تائب عن کل کفر، میری ہر کفر سے توبہ۔ضحاک نے کہا جاؤ بابا جاؤ۔

امام صاحب گھر آ گئے۔مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے بڑے مزے سے یہ روایت بیان کی ہے۔امام صاحب گھر پہنچے تو علماء کا ایک وفد پیچھے پیچھے پہنچا کہ بابا جی آپ تو اپنی ذہانت اور حوصلے سے اپنی جان چھڑوا آئے ہو لیکن ہمارا کیا بنے گا اور پھر کوفہ کی آبادی کیا کرے گی۔چنانچہ امام صاحبؒ اِس دفعہ خود ضحاک کے پاس گئے اور وہاں جا کر کھڑے ہو گئے۔ضحاک نے پوچھا، بابا اب کس لیے آئے ہو؟ امام صاحب نے کہا، ایک بات سمجھنے کے لیے آیا ہوں۔اس نے پوچھا، کیا؟ فرمایا، آپ نے کہا ہے کہ کوفہ کی آبادی ایک ایک کر کے میرے سامنے آ کر توبہ کرے اور جو توبہ نہیں کرے گا وہ قتل کر دیا جائے گا۔تو میرا سوال یہ ہے کہ وہ توبہ کس چیز سے کریں۔ضحاک نے کہا کہ وہ ارتداد سے توبہ کریں کیونکہ وہ مرتد ہو گئے ہیں۔امام صاحب نے کہا، اچھا۔مرتد تو اسے کہتے ہیں جو اپنا دین تبدیل کر لے۔کوفہ کے لوگ اپنے باپ دادا کے دین پر ہیں یا انہوں نے کوئی دوسرا دین اختیار کر لیا ہے۔یہ لوگ تو اسی دین پر ہیں جس پر پیدا ہوئے تھے۔انہوں نے تو اپنا دین تبدیل نہیں کیا تو پھر وہ مرتد کیسے ہو گئے۔ضحاک چونک پڑا اور کہا کہ أعد، اپنی بات دہراؤ، تم کیا کہہ رہے ہو۔اس پر امام صاحب نے اپنی بات دہرائی اور ضحاک سے کہا کہ تم کوفہ کی آبادی کو مرتد قرار دے

کران سے توبہ کا مطالبہ کررہے ہو۔ مرتد تو اسے کہتے ہیں جو اپنا دین تبدیل کر کے کوئی دوسرا دین اختیار کرے جبکہ یہ کوفہ کے لوگ تو جس دین پر پیدا ہوئے تھے اسی دین پر چلے آرہے ہیں، انہوں نے تو اپنا دین تبدیل نہیں کیا تو پھر یہ لوگ کیسے مرتد ہوگئے۔ اس پر ضحاک نے کہا، ہاں یہ تو ہم سے غلطی ہوگئی۔ اس نے اپنے لشکر سے کہا کہ اپنی تلواریں نیچی کرلو۔ چنانچہ امام صاحبؒ ضحاک سے اس کی غلطی کا اعتراف کروا کر گھر واپس آئے اور بغیر کسی جنگ وجدل کے، اپنے علم، حوصلہ وذہانت سے معاملہ حل کیا۔ جسے محاورے کی زبان میں کہتے ہیں کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

اہل کوفہ، امام ابوحنیفہؒ کے موالی

ابومعاذ بلخیؒ کا قول ہے:

اهل الكوفة كلهم موالى ابى حنيفة لانه كان سبب عتقهم.

کوفہ کی ساری آبادی ابوحنیفہ کی موالی ہے کہ وہ ان کی آزادی کا سبب بنے ہیں۔

امام صاحبؒ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا معیار بھی ہمیں دکھایا اور یہ بھی بتایا کہ امت مشکل میں پھنس جائے تو دانشوروں کا کیا کام ہوتا ہے۔ یعنی امام صاحب نے ہمیں یہ سبق دیا کہ قوم مشکل میں پھنس جائے اور کسی آزمائش میں مبتلا ہوجائے تو دانشوروں کا کام یہ ہوتا ہے کہ حکمت عملی اور تدبر سے قوم کو اس مصیبت سے نکالیں۔ ورنہ بصرہ کا منظر کوفہ والوں کے سامنے تھا۔ لیکن کوفہ والے امام صاحبؒ کے حوصلے، تدبر اور حکمت عملی کی وجہ سے اِس صورت حال سے نکلے۔

امام صاحبؒ کا سیاسی کردار

امام صاحب کو بنوامیہ، بنوعباس، خوارج اور معتزلہ، ان سب ادوار کا سامنا کرنا پڑا۔ امام صاحبؒ کسی تحریک میں براہ راست شریک نہیں ہوئے لیکن انہوں نے ہر اصلاح کی تحریک کی سپورٹ کی۔ نفس زکیہ کو بھی سپورٹ کیا اور ابراہیم کو بھی، لیکن خود شریک نہیں ہوئے جس کی اپنی مصلحتیں تھیں۔ امام صاحبؒ کی زندگی میں ایک ایسا موقع بھی آیا کہ بنوعباس کے ایک بڑے کمانڈر کو نفس زکیہ کے بھائی ابراہیم کے خلاف فوج کشی کا حکم ہوا۔ امام صاحبؒ نے اسے بلا کر کہا کہ نہیں

بھئی ایسا نہ کرنا۔جس پر اس نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا لیکن ابراہیم کے خلاف فوج کشی نہیں کی۔ یہ میں امام صاحب کا سیاسی رول بتا رہا ہوں۔امام صاحب نے پس پشت اصلاح کی ہر تحریک کی مالی، سیاسی واخلاقی سپورٹ کی۔

نظامِ ظلم کا حصہ بننے سے انکار

یہ بات آپ کے علم میں ہوگی کہ امام صاحبؒ کی آخری عمر کہاں گزری۔ یہ بنوعباس کا دور آ گیا تھا۔امام صاحبؒ کو قاضی القضاۃ کا عہدہ پیش کر کے اپنے سسٹم میں حصہ بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔اصل بات یہ نہیں تھی کہ قضاء کے عہدے پر ایک عادل آدمی بیٹھے، بلکہ حاکم کا اصل منشاء یہ تھا کہ ایک صاحب علم آدمی جس کی بات دنیا مانتی ہے، ہمارے سسٹم کا حصہ بن جائے اور ہماری قوت میں اضافہ کرے۔ چنانچہ امام صاحب نے انکار کر دیا تھا۔اس پر بڑا مکالمہ بھی ہوا، دونوں طرف سے قسمیں بھی اٹھائی گئیں۔ پھر امام صاحبؒ کے انکار پر انہیں جیل بھیج دیا گیا۔بعض روایات ہیں کہ امام صاحبؒ کو کوڑے بھی مارے گئے۔امام صاحبؒ نے جیل قبول کر لی لیکن ظلم کے نظام کا حصہ نہیں بنے۔

یہ میں نے آپ حضرات کے سامنے امام صاحبؒ کی زندگی کی دو تین جھلکیاں پیش کی ہیں۔ اس لیے امام صاحب ہمارے لیے سیاسی دنیا میں ایک اسوہ ہیں۔اللہ کرے کہ ہم بھی ان میں سے کسی بات کی پیروی کر سکیں۔ وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین۔

اسلامی قانون سازی میں امام ابوحنیفہؒ کا اسلوب

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ جمیع الانبیاء والمرسلین خصوصاً علیٰ سید الرسل وخاتم النبیین وعلیٰ اٰلھم واصحابھم واتباعھم اجمعین. اما بعد.

حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ عالم اسلام کی ایک عظیم علمی شخصیت تھے۔ امام صاحبؒ کی شخصیت کے بیسیوں پہلو ہیں۔ میں اپنے ذوق کی مناسبت سے ایک آدھ پہلو پر کچھ عرض کرنا چاہوں گا۔ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کی زندگی کے بہت سے پہلو ہیں جن پر گفتگو ہوسکتی ہے اور ہونی چاہیے۔ آج کے وقت کی ضرورت یہ ہے کہ علمی وعوامی سوسائٹی کو امام صاحبؒ کی شخصیت سے متعارف کروایا جائے۔ ان کی تعلیمات، ان کی خدمات، ان کی جدوجہد اور ان کے ذوق سے آج کی دنیا کو روشناس کرایا جائے۔ تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میری یہ رائے ہے کہ آج کے دور میں بھی دنیائے اسلام کی علمی، سیاسی اور عملی دنیا میں کوئی شخصیت اگر صحیح راہنما اور آئیڈیل ہوسکتی ہے تو وہ امام اعظم ابوحنیفہؒ کی شخصیت ہے۔ لیکن میں تفصیلات میں جائے بغیر آپ کی خدمت میں دو سوالات پیش کروں گا اور پھر ان سوالات کے دائرے میں گفتگو کرنا چاہوں گا۔

امام ابوحنیفہؒ کا قاضی القضاۃ کا منصب قبول نہ کرنا

تاریخ کا ایک سوال ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ نے قاضی القضاۃ کا منصب قبول نہیں کیا تھا لیکن اپنی جان قربان کردی تھی۔ یعنی آپؒ نے چیف جسٹس کا منصب قبول نہیں کیا تھا، لیکن جیل قبول کرلی تھی، اور پھر جیل کے اندر آپ کو زہر پلایا گیا جس کے نتیجے میں آپ کی موت واقع ہوئی۔ میں تفصیلات میں نہیں جاتا لیکن بنیادی سوال یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے تو یہ منصب قبول نہیں کیا

لیکن بعد میں ان کی مسند پر بیٹھنے والے، اوران کے جانشین حضرت امام ابو یوسفؒ نے یہ منصب قبول کرلیا تھااور قاضی القضاۃ بن گئے تھے۔تو ایسا کیوں ہوا۔یہ تاریخ کا ایک سوال ہے۔

اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ جس وقت امام ابوحنیفہؒ نے علمی دنیا میں قدم رکھا تو اس وقت کا ماحول کیا تھا۔امام صاحبؒ کی پیدائش ۸۰ھ کی ہے۔جب حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ امیر المؤمنین بنے تو اس وقت حضرت امام صاحب ۱۹ یا ۲۰ سال کے تھے اور علمی دنیا میں قدم رکھ چکے تھے۔حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو عمرِ ثانی کہا جاتا ہے۔اور وہ واقعتاً عمرِ ثانی تھے۔ ان کی خلافت کو خلافت راشدہ کا تتمہ کہا جاتا ہے۔حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے دواڑھائی سالہ دورِ حکومت میں کیا اصلاحات کیں اور کس طرح حکومتی نظام اور بیت المال سے بااثر لوگوں کی اجارہ داری ختم کی۔حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے خاندان کے ہاتھوں زہر پیا اور شہید ہوئے۔پھر ان کے منصب پر جو صاحب بیٹھے، ولید بن عبدالملک، انہوں نے جو پہلا آرڈر جاری کیا وہ یہ تھا کہ ہم سے پہلے یہ بزرگ دواڑھائی سال کے لیے بیٹھے تھے، یہ مجنون قسم کے آدمی تھے۔یہ پتہ نہیں کیا کچھ اقدامات کرتے رہے ہیں۔میں ان کے سارے اقدامات کو منسوخ کرتا ہوں اور اپنے عُمّال سے کہتا ہوں کہ دوتین سال پہلے کی جو کیفیت تھی، اس پر واپس چلے جائیں۔یہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے جانشین کا پہلا سرکاری آرڈر تھا کہ پچھلے دوتین سالوں میں جو ہوا وہ سب بھول جاؤ۔ چنانچہ ساری بیوروکریسی اور سارا حکومتی نظم پچھلی پوزیشن پر واپس چلا گیا۔خیر اس کی تفصیلات کا یہ وقت نہیں ہے۔

تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میرا یہ تجزیہ ہے کہ امام صاحبؒ نے جب یہ منظر دیکھا کہ جس نہج پر اسلامی حکومت کا نظام آگے بڑھ رہا ہے، اس صورت حال میں دو بنیادی کام ضروری ہیں۔

(۱) اسلامی قانون سازی

(۲) حکومتی مناصب کے لیے اَفراد سازی

چنانچہ امام صاحبؒ نے اپنے آپ کو اِن دو کاموں کے لیے وقف کر دیا۔اور پھر یہ دو کام کیے تا کہ آئندہ اسلامی ریاست وحکومت کی بنیاد بن سکیں۔

(۱) اسلامی قانون سازی

امام صاحبؒ نے یہ بھانپ لیا کہ ان کاموں کے لیے حکومت سے لاتعلق رہنا ضروری ہے کہ سرکاری سطح پر تو وہی کچھ ہونا تھا جو سرکار کے لیے قابل قبول ہونا تھا۔ اس لیے امام صاحبؒ نے شریعت کو باقاعدہ منظّم قانون اور ایک مربوط دستور کی شکل دینے کے لیے ایک پرائیویٹ اور نجی ادارہ قائم کیا۔ امام صاحبؒ نے ایک مجلس بنائی تاکہ اسلامی قانون دفعہ وار، قانونی نظم اور قانونی ترتیب کے ساتھ سامنے آئے اور اس طرح اسلامی قانون کو ایک علمی حصار ملے۔ یعنی اہل علم کے اعتماد کے ساتھ ایک مربوط قانون موجود ہو اور آنے والے دور میں کسی کو یہ موقع نہ ملے کہ اسلامی قانون کے نام پر جو چاہے کرے۔ امام ابوحنیفہؒ نے جو مجلس قائم کی، اس میں اجتماعی مشاورت کا اہتمام کیا، اہل علم کو مشاورت میں شریک کیا، مباحثے کی دعوت دی، اور سالہا سال کی محنت سے اسلامی قانون کی ۸۰ ہزار سے زیادہ دفعات مرتب کیں۔ اور یہ قانون اس طریقے سے دفعہ وار مرتب کیا کہ فلاں معاملہ ہوگا تو اس کا حل یہ ہوگا، اور فلاں مسئلہ درپیش ہوگا تو اس کا سدباب فلاں طریقے سے کیا جائے گا۔

امام صاحبؒ کے اس کام سے پہلے قانون سازی کو فقہ فرضی کہا جاتا تھا۔ اس پہلے یہ ہوتا تھا کہ کوئی واقعہ پیش آتا تب غور کیا جاتا کہ اسلامی شریعت میں اس کا کیا حل ہے۔ بلکہ یوں بھی کہا جاتا تھا کہ کوئی واقعہ اگر پیش نہیں آیا تو اس کے بارے میں کیوں مغز کھپائی کرتے ہو۔ لیکن امام صاحب نے جو فقہ پیش کی وہ اس بنیاد پر تھی کہ آنے والے واقعات کے پیش نظر دفعہ وار قانون مرتب کیا جائے کہ یہ بھی ہوسکتا ہے، وہ بھی ہوسکتا ہے، فلاں صورت حال بھی پیش آسکتی ہے، اور فلاں معاملہ بھی درپیش ہوسکتا ہے، تو ان سب کے متعلق پہلے سے غور وفکر کر کے ایک قانون مرتب کیا جائے۔ ہماری پرانی اصطلاح میں اسے فقہ فرضی کہتے ہیں جبکہ آج کے دور کی جدید اصطلاح میں اسے قانون سازی کہتے ہیں۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ نے قانون سازی کا ذوق پیدا کیا اور قانون سازی کے لیے افراد جمع کیے۔ ان کی مجلس کے بڑے ارکان چالیس کے قریب بتائے جاتے ہیں۔ جن میں نحو کے ماہرین بھی تھے، صرف کے ماہرین بھی تھے، فقہ کے ماہرین بھی تھے، معاملات کے ماہرین بھی تھے،

تجارت کے ماہرین بھی تھے، الغرض زندگی کے مختلف شعبوں کے ماہرین اور اہل علم حضرات کو جمع کیا اور سالہا سال ایک اجتماعی فقہ مرتب کرنے کے لیے صرف کیے۔ میں ایک بات عرض کیا کرتا ہوں جس سے آپ کو اختلاف کا حق ہے کہ میرے نزدیک فقہ حنفی شخصی فقہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک اجتماعی فقہ ہے۔ فقہ حنفی ایک فرد کی فقہ نہیں ہے بلکہ مشاورت کی فقہ ہے۔ دنیائے اسلام میں قانون سازی کا پہلا مربوط کام امام ابوحنیفہؒ اور ان کی جماعت نے کیا۔ آج کی سیاسی دنیا میں ایک بڑا سوال ہے کہ اسلامی ریاست میں قانون سازی جائز ہے یا نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بھئی قانون سازی تو سب سے پہلے ہم نے کی ہے اور مجلس قائم کر کے کی ہے اور پھر ۸۰ ہزار سے زیادہ دفعات پر مشتمل ایک قانونی ذخیرہ امت کو دیا ہے۔

فقہ حنفی کی مقبولیت وعروج کی وجہ

قانون سازی کا یہ کام تو امام ابوحنیفہؒ اور ان کی جماعت نے کیا۔ لیکن پھر اسلامی تاریخ کا سب سے پہلا دستور کس نے لکھا ہے۔ یہ ہارون الرشید کی درخواست پر امام ابو یوسفؒ نے لکھا جو کہ امام ابوحنیفہؒ کے جانشین تھے۔ ہارون الرشید نے پوچھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے اور کیسے نظام چلانا چاہیے۔ اس زمانے میں زیادہ مسئلہ مالیات کا ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ حضرت امام ابو یوسفؒ نے ہارون الرشید کی درخواست پر 'کتاب الخراج' لکھی۔ اور کتاب الخراج ایک مالیاتی دستور کے طور پر ہارون الرشید کے دور میں نافذ ہوئی۔ پھر اس کے بعد یہ فقہ حنفی عباسی دور میں، عثمانی دور میں اور مغل دور میں چلتی رہی۔

یہاں ایک بات پر غور فرمائیں کہ دنیا میں یہ سوال ہوتا ہے اور لوگ یہ تجزیہ کرتے ہیں کہ فقہ حنفی کو دنیا میں عروج کیوں حاصل ہوا کہ عباسیوں کی فقہ بھی وہی تھی، عثمانیوں کی فقہ بھی وہی تھی اور مغلوں کی فقہ بھی وہی تھی۔ ایک جواب تو یہ دیا جاتا ہے کہ چونکہ فقہ حنفی والے اقتدار میں آ گئے تھے، اس لیے ان کی فقہ کو پذیرائی ملی۔ میرا تجزیہ ہے کہ ایسی بات نہیں ہے۔ اس کی اصل وجہ امام ابوحنیفہؒ کا وہ کارنامہ تھا کہ جس حکومت کو مربوط، دفعہ وار اور باقاعدہ ایک مرتب قانون کی ضرورت پیش آئی، تو ایسا قانون صرف حنفیوں کے پاس ہی تھا، اور کسی کے پاس تھا ہی نہیں۔ حکومتوں کو تو ایک اچھے مرتب قانون کی ضرورت ہوتی ہے۔ نئے قانون کوئی اتنی آسانی سے تو نہیں بن جایا کرتے۔ اس کے

لیے زندگی کے مختلف شعبوں کے ماہرین کی سالہا سال کی عرق ریزی درکار ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک مرتب قانون کی جب بھی کسی کو ضرورت پیش آئی تو وہ صرف حنفیوں کے پاس تھا۔ باقی آئمہ بھی میرے آئمہ ہیں، ان کا احترام اور ان کی خدمات کا اعتراف اپنی جگہ پر۔ لیکن یہ بات کہ اجتماعی مشاورت کے ساتھ، کھلے مباحثوں سے، اور مسئلوں کے تمام پہلوؤں پر غور وفکر کر کے جو قانون مرتب ہوا، ایسا مرتب ومنظم قانون کسی دوسری فقہ کے پاس نہیں تھا۔

امام صاحبؒ کی قانون ساز مجلس کا ماحول

حضرت امام ابوحنیفہؒ نے تو اپنے ہاں علمی مباحثے کا یہ ماحول پیدا کیا تھا کہ آپ کی محفل میں آپ کے شاگردوں کو اختلاف رائے کا پورا حق حاصل تھا۔ شاگرد احترام کے دائرے میں رہ کر دلیل کے ساتھ اپنا اختلاف پیش کرتے۔ اگر امام صاحب ان کا اختلاف تسلیم نہ کرتے تو شاگرد یہ نہ کہتے کہ ٹھیک ہے استاد نے جو کہہ دیا ہم نے مان لیا۔ بلکہ وہ باقاعدہ الگ اپنا اختلافی نوٹ لکھواتے کہ اس مسئلے میں ابو یوسف کا موقف یہ ہے، محمد کا موقف یہ ہے، امام زفرؒ کا موقف یہ ہے اور امام حسنؒ کا موقف یہ ہے۔ امام صاحبؒ کی محفل میں ایک مسئلے پر ہفتوں بحث چلتی رہتی تھی، سب باری باری اپنے دلائل پیش کرتے تھے۔ چنانچہ بہت سے مسائل میں ہمارے ایک سے زیادہ اقوال ہیں۔

حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ نے انفرادی اجتہاد کی بجائے اجتماعی اور مشاورتی اجتہاد کا راستہ اختیار کیا تھا اور اس کے لیے کھلے علمی مباحثہ کو ضروری خیال کیا تھا۔ اس کا خاکہ مولانا مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:

> ''اجتماعی مساعی اسی وقت باور آور ہوتی ہیں جب ضبط ونظم کے تحت ان کو انجام دیا جائے۔ امامؒ پر جہاں یہ راز واضح ہو چکا تھا، اسی کے ساتھ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ مجلس کے تمام اراکین کو جب تک کامل آزادی اپنے خیالات کے اظہار میں نہیں دی جائے گی، اجتماع کا جو مقصد ہے وہ پورا نہیں ہوسکتا۔ آزادی کے اس دائرے کو امامؒ نے کتنی وسعت دے رکھی تھی؟ اس کا اندازہ اسی واقعے سے ہوسکتا ہے جس کو امامؒ کے مختلف سوانح نگاروں نے نقل کیا ہے۔ الجرجانی کہتے ہیں کہ میں امام کی مجلس میں حاضر تھا کہ ایک نوجوان جو اسی

حلقہ میں بیٹھا ہوا تھا، امام سے اس نے کوئی سوال کیا جس کا امامؒ نے جواب دیا، لیکن جوان کو میں نے دیکھا کہ جواب سننے کے ساتھ ہی بے تحاشہ اور امام کو مخاطب کر کے 'اخطات' (آپ نے غلطی کی ہے) کہہ رہا ہے۔ جرجانی کہتے ہیں کہ جوان کے اس طرز گفتگو کو دیکھ کر میں تو حیران ہو گیا اور حلقہ والوں کی طرف خطاب کر کے میں نے کہا کہ

''بڑے تعجب کی بات ہے کہ استاذ (شیخ) کے احترام کا تم لوگ بالکل لحاظ نہیں کرتے۔''

جرجانی ابھی اپنی نصیحت کو پوری بھی نہیں کر پائے تھے کہ وہ سن رہے تھے کہ خود امام ابوحنیفہؒ فرما رہے ہیں کہ

دعهم فانی قد عودتهم ذلک من نفسی.

''تم ان لوگوں کو چھوڑ دو، میں نے خود ہی اس طرز کلام کا ان کو عادی بنایا ہے۔''

جس سے معلوم ہوا کہ اس آزادی کا قصداً و ارادتاً امام نے اپنی مجلس کے اراکین کو کہیے یا تلامذہ کو، عادی بنا رکھا تھا اور یہ جان کر بنا رکھا تھا کہ جو مقصد ہے، اس آزادی کے بغیر وہ حاصل نہیں ہو سکتا۔'' (امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی، ص ۲۳۸)

چنانچہ امام صاحبؒ کا یہ کارنامہ تھا کہ مربوط قانون سازی کی ایک نجی مجلس قائم کی، اور آج تک اسی مجلس کے چالیس علماء و ماہرین کا کیا ہوا کام دنیا بھر میں اسلامی قانون سازی کی بنیاد ہے۔

(۲) حکومتی مناصب کے لیے افراد سازی

امام صاحبؒ نے دوسرا کام جو کیا وہ تھا افراد سازی۔ میں اس کے لیے کسی لمبی بات کے بجائے ایک حوالہ پیش کرنا چاہوں گا۔ جب امام صاحبؒ کا علمی کام تکمیل کے مرحلے کو پہنچا تو امام صاحبؒ نے کوفہ کی جامع مسجد میں ایک اجتماع کیا۔ روایت ہے کہ تقریباً ایک ہزار کے قریب علماء اس اجتماع میں جمع ہوئے جن سے امام صاحبؒ نے خطاب فرمایا، اور یہ امام صاحبؒ کے شاگرد تھے۔ اِس خطاب کے کچھ حصے حضرت مناظر احسن گیلانیؒ نے اپنی کتاب ''امام ابوحنیفہؒ کی سیاسی زندگی'' میں

نقل کیے ہیں۔

امام صاحبؒ نے اپنے شاگرد علماء سے خطاب کیا کہ بھئی میں نے تم لوگوں کو پڑھایا ہے اور تمہیں تیار کیا ہے۔تم میں سے چالیس تو وہ ہیں جو قاضی بننے کی اہلیت رکھتے ہیں، اوران میں سے دس وہ ہیں جو قاضیوں کی تربیت ونگرانی کی اہلیت بھی رکھتے ہیں۔ یہ میں نے رجال کار تیار کیے ہیں تاکہ حکومتی مناصب پر جو لوگ فائز ہوں، وہ اہلیت کے حامل ہوں۔ اب میں تمہیں امت کے حوالے کررہا ہوں۔

نفاذِ اسلام کا مطالبہ اوراس کے تقاضے

یعنی امام صاحب نے دوسرے لفظوں میں یہ کہا کہ صرف یہ مطالبہ کردینا کافی نہیں ہے کہ اسلام نافذ کرو۔ اسلام نافذ کرنے کے لیے اسلامی نظام چلانے والے بندے تیار کرکے دینا بھی ہماری ذمہ داری ہے۔اوراما م صاحبؒ نے فرمایا کہ میں نے تم لوگوں کو اسی مقصد کے لیے تیار کیا ہے تاکہ تم ایک اسلامی حکومت کی باگ ڈور سنبھال سکو۔ اورتم لوگوں میں سے چالیس لوگ قاضی بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور دس وہ ہیں جو قاضی سازی یعنی نئے قاضی بنانے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔یعنی آئندہ اگر قاضیوں کی ضرورت ہوئی تو یہ دس آدمی میرے والا کام کریں گے۔ امام صاحبؒ خود قاضی نہیں بنے کہ اس اہم کام کے لیے حکومتی اَثر سے الگ رہنا ضروری تھا، لیکن شاگردوں کو قضا کے لیے تیار کیا۔

امام صاحبؒ نے صرف صحیح اسلامی نظام کے نفاذ کا ہی مطالبہ نہیں کیا بلکہ امام صاحبؒ نے یہ جانچ لیا کہ جب تک اسلامی قانون ایک مدوّن شکل میں موجود نہ ہو، اور جب تک قانون کو سمجھنے والے اور قانون کے مطابق فیصلے کرنے والے قاضی موجود نہ ہوں، اس وقت تک بات آگے نہیں بڑھے گی۔ گویا امام صاحبؒ نے اپنے وقت میں امت کی علمی وافرادی ضرورت کو پورا کیا کہ ایک قانون مرتب کیا اوراسے چلانے والے افراد تیار کیے اور پھر دنیا کو دو عظیم تحفے دے کر دنیا سے تشریف لے گئے۔ایک قانون اوردوسرا قانون چلانے والے اہل کارلوگ۔

امام ابو یوسفؒ کا قضاۃ کا منصب قبول کرلینا

اب یہ وقت تھا کہ امام یوسف قاضی القضاۃ کا منصب قبول کرلیتے۔تاریخ کے حوالے سے یہ

بات کہی جاتی ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے تو قاضی القضاۃ کا منصب قبول نہیں کیا لیکن ان کے شاگرد اور جانشین امام ابو یوسفؒ نے قبول کرلیا تھا، آخر کیوں؟

اس بات کو سمجھنے کے لیے میں یہاں اپنے ایک بیوروکریٹ دوست کی رائے عرض کرنا چاہوں گا۔نوے کی دہائی میں پاکستان میں شریعت بل کے نفاذ کی جدوجہد عروج پر تھی۔ میں بھی شریعت بل کے نفاذ کی تحریک کا ایک سرگرم کارکن تھا۔ ہم دینی سوچ رکھنے والے سب علماء وطلباء اور عوام الناس بہت متحرک تھے۔سرکاری سطح پر ہم اراکین پارلیمنٹ سے ملاقاتیں کرتے اور انہیں اِس بل کی ضرورت اور افادیت سے آگاہ کرتے۔عوامی سطح پر ہم جلسے کرتے تھے اور جلوس نکالتے تھے، ایک وقت میں تو ہم نے پارلیمنٹ کے سامنے زبردست عوامی مظاہرہ کیا تھا۔اس زمانے میں غلام مرتضیٰ پراچہ صاحب ہمارے گوجرانوالہ شہر کے کمشنر ہوتے تھے۔ پراچہ صاحب بڑے پرانے اور گھاک قسم کے بیوروکریٹ تھے اور میرے دوست تھے۔ایک دن ہم ایک شادی کی مجلس میں بے تکلفی سے بیٹھے ہوئے تھے، بارات کا انتظار ہو رہا تھا اور ہمارے پاس بات کرنے کے لیے وقت تھا۔ یہ شریعت بل کی تحریک کے عروج کا زمانہ تھا۔ پراچہ صاحب نے پوچھا، مولوی صاحب (سیاسی حوالے سے) کیا ہو رہا ہے؟ میں نے کہا، شریعت بل کی تحریک چلا رہے ہیں۔ پوچھا، اس سے کیا ہوگا؟ میں نے کہا، شریعت نافذ ہوگی۔ پوچھا کیسے؟ میں نے کہا، اسلامی شریعت کو ملک میں قانون کی حیثیت حاصل ہوگی۔ پراچہ صاحب نے کہا، وہ تو ٹھیک ہے کہ شریعت ملک کا قانون بن جائے گی، لیکن اسے تم لوگ ملک کے اندر عملی طور پر نافذ کیسے کرو گے؟ پھر پراچہ صاحب نے دو باتیں کہیں۔ پہلی یہ کہ مولوی صاحب، موجودہ سسٹم کے اندر تم لوگ (مولوی صاحبان) اقتدار میں نہیں آسکتے۔ یہ سسٹم بنایا ہی ایسا گیا ہے۔اور فرض کرلو کہ تم لوگ اقتدار میں آجاتے ہو اور ایک مولوی صاحب وزیراعظم بن جاتے ہیں۔ پھر کیا ہوگا؟ انہوں نے کہا کہ چلیں دو منٹ کے لیے فرض کرلیتے ہیں کہ آپ وزیراعظم بن جاتے ہیں، اب آپ بحیثیت وزیراعظم کیا کریں گے؟ میں نے کہا کہ شریعت نافذ کروں گا۔ پراچہ صاحب نے کہا، مولوی صاحب شریعت کس کے ذریعے نافذ کریں گے؟ میرے ذریعے؟ چار ضلعے تو میرے کنٹرول میں ہیں۔ کیا آپ میرے جیسے افسروں کے ذریعے شریعت نافذ کرنے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔اگر میری جگہ پر بٹھانے کے لیے تمہارے

پاس کوئی اپنا بندہ ہے تو پھر شریعت کی بات کرو، ورنہ بھول جاؤ۔ اگر تمہارے پاس یہ انتظام ہے کہ ایسے افسر لگا سکو جو اسلامی شریعت کو سمجھتے ہیں اور تمہارے مزاج کے مطابق کام کر سکتے ہیں، پھر شریعت کی بات کرو۔ لیکن اگر اس موجودہ بیوروکریسی کے ذریعے اسلامی نظام نافذ کرنا ہے تو پھر مولوی صاحب خواہ مخواہ وقت ضائع مت کرو۔ یہ بات پراچہ صاحب نے ۸۸ء میں کہی۔

میں نے عرض کیا کہ امام صاحبؒ نے قانون سازی بھی کی اور افراد سازی بھی۔ اور یہ دو مضبوط بنیادیں فراہم کیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج بھی جب اسلام کے نفاذ کی ہوتی ہے تو اس کے بارے میں کوئی ابہام نہیں ہوتا بلکہ یہ یقین ہوتا ہے کہ ہمارے پاس ایک اسلامی قانون میسر ہے جس میں صرف آج کے زمانے کے مطابق تجدید کرنے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ جب یہ دو بنیادیں موجود نہیں تھیں تو امام صاحبؒ نے قاضی القضاۃ کا منصب قبول نہیں کیا۔ لیکن امام ابو یوسفؒ کے زمانے میں یہ دو بنیادیں موجود تھیں، ایک مدوّن قانون موجود تھا، اور قانون کو چلانے والے افراد موجود تھے، سارا اِنتظام مکمل تھا، اس لیے انہوں نے قاضی القضاۃ کا منصب قبول کیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ موقع دیا اور انہوں نے امام ابوحنیفہؒ کے تیار کیے ہوئے قانون اور افراد کو ایسے استعمال کیا کہ پھر فقہ حنفی آئندہ صدیوں میں عباسیوں کے قانون کی بنیاد بھی بنی اور اس کے بعد مغلوں کے قانون کی بنیاد بھی بنی۔

آج کا دور اور امام صاحبؒ کی حکمت عملی

کچھ دیر کے لیے تصور کریں کہ اگر امام صاحبؒ آج ہمارے ہاں موجود ہوتے تو آج کے ہمارے حالات کے تناظر میں اُن کی کیا حکمت عملی ہوتی اور وہ ہمیں اس ناگفتہ بہ صورت حال سے نجات دلانے کے لیے کونسے کام کرتے؟ میری رائے میں امام صاحب مندرجہ ذیل تین کام کرتے:

- ☆ اصلاحِ نظام اور نفاذِ اسلام کی تحریکات کی سرپرستی
- ☆ گوڈ گورننس کے قیام کے لیے راہنمائی
- ☆ علمی دنیا میں اجتماعی مشاورت کا اہتمام

اصلاحِ نظام کی تحریکات کی سرپرستی

پہلا کام میرے خیال میں امام صاحبؒ یہ کرتے کہ وہ اصلاحِ نظام اور نفاذِ اسلام کی تحریکات کی سرپرستی کرتے۔اس لیے کہ امام صاحبؒ کے دور میں بھی اصلاحِ نظام کی تحریکیں تھیں، مسلح بھی اور غیر مسلح بھی۔امام زید ابن علی کی تحریک، محمد بن ابراہیم کی تحریک، اور پھر نفس زکیہ کی تحریک۔ یہ اُس دور کے مطابق اصلاح عامہ کی تحریکیں تھیں۔امام صاحب نے یہاں بھی حکمت عملی سے کام لیا کہ خود براہ راست سامنے نہیں آئے لیکن ان تحریکوں کی پشت پناہی اور سرپرستی کی۔ مالی معاونت بھی کی، سیاسی سپورٹ بھی کی، مشاورت بھی کی اور اخلاقی سپورٹ بھی کی۔ میرے خیال میں امام صاحبؒ آج ہمارے ہاں ہوتے تو آج کی دینی واصلاحی تحریکوں کے سب سے بڑے سرپرست ہوتے۔

لیکن ظاہر ہے کہ امام صاحبؒ آج ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں۔لیکن امام صاحب کی سیرت ہمارے سامنے ہے۔ان کی حکمت عملی، ان کے طریقہ کار اور ان کی جدوجہد کے وہ سارے پہلو ہم سنتے، پڑھتے اور لکھتے ہیں۔ چنانچہ ہم یقیناً امام صاحبؒ کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی روشنی میں، ان کی جدوجہد کے طریقہ کار سے اور اُن کی ذہانت وفراست سے راہنمائی لیتے ہوئے آج کے دور میں ایک فلاحی اسلامی حکومت کے قیام وبقاء کے لیے اپنی حکمت عملی وضع کرسکتے ہیں۔

گڈ گورننس کے قیام کے لیے راہنمائی

دوسرا کام آج کے دور میں امام صاحبؒ یہ کرتے کہ ہمارے معاشرے کو ناانصافی اور بدعنوانی سے نجات دلاتے۔آج کے دور کا ایک بہت بڑا مسئلہ جسے ایک عام آدمی سے لے کر سپریم کورٹ کے چیف جسٹس تک ہر آدمی ایک تشویشناک مسئلہ سمجھتا ہے، وہ ہے کرپشن اور بددیانتی۔ یہ کرپشن ہماری قوم کو اوپر سے نیچے تک کھا گئی ہے اور برباد کرگئی ہے۔ امام صاحبؒ کی ذات عالیہ کی جو کمال درجے کی صفتِ انصاف اور صفتِ امانت تھی، ہمیں آج کے دور میں اُن کی ضرورت ہے۔ میں ایک دن امام صاحبؒ کی دیانت کا یہ واقعہ پڑھ رہا تھا کہ ایک بیمار دوست کے ہاں عیادت کے لیے گئے۔امام صاحبؒ کے بیٹھے بیٹھے وہ بندہ فوت ہوگیا۔ چراغ جل رہا تھا، امام صاحبؒ نے پھونک مار کر چراغ بجھا دیا۔اور ایک ساتھی کو پیسے دیے کہ جا کر بازار سے چراغ لے کر آؤ۔اور فرمایا کہ

دیکھو بھئی، جب تک یہ شخص زندہ تھا، یہ چراغ اس کی مِلک تھی۔اس کے فوت ہونے کے بعد یہ چراغ ورثاء کی مشترک مِلکیت ہے۔اور ورثاء کی مِلک سب کی رضامندی کے بغیر استعمال نہیں کرنی چاہیے،اس لیے میں نے یہ چراغ بجھادیا۔

چنانچہ آج ہمارے لیے امام صاحبؒ کے اسوہ میں انصاف اور امانت کا یہ سبق موجود ہے کہ کس طرح چھوٹی سے چھوٹی چیز اور معمولی سے معمولی سے معاملے میں انصاف کا پہلو اجاگر کر کے انہوں نے آنے والوں کو یہ فکر دی کہ انصاف اور دیانت انسانی معاشرے کی بقاء کی ضمانت ہوتے ہیں۔ آج ہمیں چاہیے کہ امام صاحبؒ کے سیرت اور اسوہ سے رہنمائی لیتے ہوئے کرپشن، بددیانتی اور ناانصافی کے خلاف جدوجہد اور جہاد کریں اور امانت، سچائی اور دیانت کا علم بلند کریں۔

علمی دنیا میں اجتماعی مشاورت کا اہتمام

میرا تو حضرت امام ابوحنیفہؒ کی اُس دور کی جدوجہد کے حوالے سے ایمان ہے کہ امام صاحبؒ آج ہمارے درمیان ہوتے تو وہ علمی دنیا میں اجتماعی مشاورت کو فروغ دیتے۔امام صاحبؒ الگ الگ علمی کاموں کی حوصلہ افزائی کرنے کی بجائے علمی دنیا میں اجتماعی مشاورت کا اہتمام کرتے۔ علماء کو اکٹھا کرتے کہ بھئی امت اور قوم کے مسائل پر اکٹھے بیٹھ کر سوچو اور اکٹھے مل کر اجتماعی رہنمائی کرو۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے لیے ان تمام شعبوں میں وہ اسباب موجود ہیں جن کے لیے امام ابو حنیفہؒ کی سیرت میں ہمارے لیے رہنمائی کے اسباق میسر ہیں۔میں شرحِ صدر سے یہ بات کہتا ہوں کہ آج بھی دنیا کو انفرادی واجتماعی معاملات میں، نجی وقومی معاملات میں اور دینی وعلمی معاملات میں اگر راہنمائی درکار ہے تو میری رائے میں امام ابوحنیفہؒ کی شخصیت ایک بہترین آئیڈیل ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں امام ابوحنیفہؒ کی حسنات کو زندہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین۔

عصرِ حاضر میں امام ابوحنیفہؒ کے طرزِ فکر کی اہمیت

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علیٰ سید المرسلین وعلیٰ الہ واصحابہ واتباعہ اجمعین. اما بعد.

امام صاحبؒ نے مختلف شعبوں میں مختلف حوالوں سے کام کیا ہے۔ ویسے تو پوری اسلامی تاریخ اور تمام اسلامی شخصیات کا تذکرہ ہماری آج کے دور کی ضرورت ہے۔ لیکن آج کے عمومی حالات سامنے رکھ کر میں یہ بات کہا کرتا ہوں کہ تین اسلامی شخصیات ایسی ہیں کہ آج کا پورا عالمی ماحول اور آج کی پوری دنیا ان تینوں سے فیضیاب ہوئے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتی۔ ہم میں سے ہر شخص کے لیے ضروری ہے کہ ہم آج کے تناظر میں ان تین شخصیات سے واقفیت حاصل کریں اور آج کی دنیا میں اسلام کی بات اِن شخصیات کے عنوان اور ان کی فکر کی روشنی میں کریں کہ آج کی دنیا ایسی بات زیادہ بہتر سمجھے گی۔ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی تو سب سے بالا ہے، اور صحابہ کرامؓ کا اپنا مقام ہے۔ ہر شخصیت کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے، ایک نفسیات ہوتی ہے، ایک خاص ذہنی سطح ہوتی ہے، اور پیغام پہنچانے کی ایک مخصوص فریکونسی ہوتی ہے۔

عصرِ حاضر اور تین اہم اسلامی شخصیات

آج کی دنیا کی فریکونسی ہماری تین شخصیات سے بہت فٹ بیٹھتی ہیں۔ میں آج کے نوجوان علماء کو یہ دعوت دیا کرتا ہوں کہ ان شخصیات کا بطور خاص مطالعہ کیا کریں۔

(۱) سیاسیات اور حکومت میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے،

(۲) فقہ وقانون میں حضرت اِمام ابوحنیفہؒ سے،

(۳) اور سیاسی فکر وفلسفے میں حضرت شاہ ولی اللہؒ سے۔

حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ کا طرزِ حکومت

اِنقلاب کس کا نام ہے، اصلاحِ احوال کیسے ہوتی ہے، نظم کیسے درست ہوتا ہے، امت کے مسائل کیسے حل ہوتے ہیں اور حکومت کیسے کی جاتی ہے۔ ان موضوعات پر پڑھنا ہے تو بڑے حضرت عمرؓ اور پھر ان کے پرتَو چھوٹے حضرت عمرؒ۔ یہ دونوں آئیڈیل ہیں۔ صرف ہم مسلمانوں ہی کے نہیں بلکہ باقی دنیا کے بھی آئیڈیل ہیں۔ حضرت عمر فاروقؓ بھی اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ بھی۔ میں ان شخصیات کے متعلق تفصیل میں جاؤں گا تو معاملہ لمبا ہو جائے گا لیکن میں ایک جزوی واقعہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے حوالے سے نقل کرنا چاہوں گا۔ آج ہمیں اپنے ملک میں ایک بہت بڑا مسئلہ درپیش ہے۔ وہ یہ کہ ہماری قومی دولت بڑے بڑے لوگوں کی تجوریوں میں ہے اور سرکاری خزانہ خالی ہے۔ ہمارے ملک کے سرکاری خزانے میں لوگوں کی بنیادی ضروریات پوری کرنے کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ اس کی ایک چھوٹی سی جھلک آپ کے سامنے پیش کرنا چاہوں گا۔ چند ہفتے پہلے آپ نے بھی سوئس بینکوں کے ایک ڈائریکٹر کا یہ بیان اخبارات میں پڑھا ہوگا۔ اس نے کہا کہ ہمارے سوئس بینکوں میں پاکستانیوں کی اتنی دولت بیکار پڑی ہے کہ اگر یہ دولت واپس پاکستان چلی جائے تو پاکستان کو تیس سال تک اپنے بجٹ میں کوئی نیا ٹیکس لگانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اور اس نے یہ لکھا کہ سوئس بینکوں میں پاکستانیوں کی رقوم جو بے مصرف پڑی ہیں، اگر یہ واپس پاکستان چلی جائیں تو یہ اتنی رقم ہوگی کہ حکومت پاکستان اگر اپنے ہر شہری کو بیس ہزار روپے سالانہ وظیفہ دے تو یہ رقوم ساٹھ سال کے لیے کافی ہوں گی۔ یعنی ہمارا سرکاری خزانہ اور سرکاری دولت یا اثر لوگوں کی ذاتی تجوریوں میں ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ ۹۹ھ یا ۱۰۰ھ میں برسرِ اقتدار آئے۔ حضرت عمرؒ نے تقریباً اڑھائی برس حکومت کی لیکن اس مختصر عرصے میں انہوں نے جس طرح حکومت کی اور حکومتی نظام میں جس طرح انہوں نے اصلاحات کیں اسے آج تک دنیا یاد کرتی ہے۔ امام سیوطیؒ نے لکھا ہے کہ جب وہ اقتدار میں آئے تو سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ بیت المال کے پچاسی فیصد اثاثے شاہی خاندان کے قبضے میں تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے ایک دوست تھے حیوۃؒ۔ محدثین کے ہاں یہ ایک بڑا نام ہے۔ انہوں نے حضرت عمر بن عبدالعزیز سے ذکر کیا کہ میں نے ایک خواب دیکھا ہے کہ

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ ایک محفل میں تشریف فرما ہیں۔ حضورؐ کی اس محفل میں تم (عمر بن عبدالعزیز) اور میں (حیوۃ) بھی بیٹھے ہیں۔ حضورؐ نے تم سے خطاب کر کے کہا کہ اگر تمہیں حکومت ملے تو ابوبکر و عمر جیسی حکومت کرنا۔

چنانچہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ جب خلیفہ بنے تو سب سے بڑا مسئلہ جو درپیش تھا وہ یہ تھا کہ شاہی خاندان سے پچاسی فی صد اثاثے وصول کیے جائیں کہ یہ سارے اثاثے بیت المال واپس آئیں اور بیت المال اپنا نظام صحیح طریقے سے چلائے۔ خود حضرت عمر بن العزیزؒ کے ذاتی قبضے وہ معروف باغ فدک تھا جو کہ تاریخ میں ایک معرکۃ الاراء باغ ہے۔ حلف اٹھانے کے بعد، بیعت کے بعد سب سے پہلا کام انہوں نے یہ کیا کہ بیت المال کے انچارج کو بلایا اور کہا کہ یہ باغ میرے قبضے میں چلا آ رہا ہے، یہ باغ تم بیت المال کے لیے واپس لے لو۔ جس باغ پر سیدہ فاطمہؓ کا حق تسلیم نہیں ہوا، میں کون ہوتا ہوں اس باغ پر اپنا قبضہ رکھنے والا۔ چنانچہ انہوں نے سب سے پہلے اپنی جائیداد واپس کی۔ پھر اپنے گھر اپنی بیوی کے پاس تشریف لے گئے۔ فاطمہ بنت عبد الملک۔ وہ خاتون جسے ایک امیر المؤمنین کی بیٹی، ایک امیر المؤمنین کی بیوی، اور بعد میں تین امراء المؤمنین کی بہن بننے کا اعزاز حاصل ہے۔ اور پھر کمانڈر انچیف مسلمہ ابن عبدالملک کی بہن تھی۔ تو حضرت عمرؒ نے اپنی بیوی فاطمہ سے کہا کہ مسلمانوں کی حکومت میرے سپرد کر دی گئی ہے اور مسئلہ بہت نازک ہے کہ ہمیں بیت المال کے اثاثے واپس کرنے ہیں۔ میں نے تو وہ باغ واپس کر دیا ہے جو میرے پاس تھا۔ جبکہ تمہیں یہ بات معلوم ہے کہ تمہارے باپ اور تمہارے بھائیوں نے جو کچھ تمہیں دے رکھا ہے، یہ ان کی ذاتی مِلک نہیں تھی بلکہ یہ سب دراصل بیت المال کی چیزیں ہیں۔ تمہارے ذاتی استعمال میں جو چیزیں ہیں، زیورات اور قیمتی کپڑے اور سامان وغیرہ، یہ سب کچھ بیت المال کی دولت سے ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے کہا کہ فاطمہ میں تم پر جبر نہیں کرتا کہ یہ چیزیں تمہیں تمہارے باپ اور بھائیوں نے دی ہوئی ہیں۔ لیکن میں یہ بات تم سے کہوں گا کہ اِس گھر میں یا تو یہ چیزیں رہیں گے یا پھر عمر رہے گا۔ یہ بیت المال کی چیزیں اور عمر دونوں یکساتھ نہیں رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ فاطمہ بنت عبدالملک کے درجات بلند فرمائے، یہ ایک اچھے زمانے کی ایک اچھی عورت تھی۔ آج کے دور میں ایسا ہوتا تو خاتون شاید یہ کہتی کہ حضرت آپ

تشریف لے جائیں، آپ کو رہنے کے لیے کوئی کوٹھی یا بنگلہ مل جائے گا، میں تو یہ سامان واپس کرنے والی نہیں۔لیکن فاطمہ نے کہا کہ حضرت میرا زیور بھی آپ ہیں اور میرا لباس بھی آپ ہی ہیں۔ اِس گھر میں جو چیز بھی بیت المال کی نظر آتی ہے، اسے اٹھا کر واپس کر دیں، یہ فاطمہ آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گی۔تو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنا باغ واپس کیا، بیوی کے زیورات اور وہ سامان واپس کروایا جو دراصل بیت المال کی دولت سے تھا۔ یہ سارا کام مکمل کر کے اپنی برادری کو، شاہی خاندان کو بلوالیا کہ بھئی بیت المال کے پچاسی فیصد اثاثے تمہارے پاس ہیں اور میں نے یہ اثاثے بیت المال کو واپس دلوانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ میں نے اپنے اور بیوی کے اثاثے واپس کر دیے ہیں، اب تم بتاؤ کہ کتنے دنوں میں اپنے تصرف کی چیزیں واپس کرتے ہو۔امام سیوطیؒ کہتے ہیں کہ پندرہ دن کے اندر اندر تمام اثاثے بیت المال کو واپس کر دیے گئے۔

یہ سیمینار امام اعظم ابوحنیفہؒ کے حوالے سے ہے اس لیے میں اِن تین اسلامی شخصیات کے تعارف کے حوالے سے یہ بات مزید لمبی نہیں کرتا۔لیکن ایک طالب علم کے طور پر میری ذاتی رائے یہ ہے کہ انقلاب اور حکومتی نظام میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ، فقہ اور قانون میں حضرت امام ابو حنیفہؒ، جبکہ فکر وفلسفے میں حضرت شاہ ولی اللہؒ۔ میں علماء سے درخواست کیا کرتا ہوں کہ ان شخصیات کا بطور خاص مطالعہ کریں۔ آج کے حالات کو سامنے رکھ کر گہرائی سے ان شخصیات اسٹڈی کریں۔ اس سے آج کے دور کے تناظر میں آپ کو اپنی جدوجہد کے حوالے سے بہت اچھی راہنمائی ملے گی اور معاملات ایک ایک کر کے آپ کے سامنے واضح ہوتے چلے جائیں گے۔

فقہ حنفی، ایک ہمہ گیر فقہ

اب میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کی طرف آتا ہوں۔امام صاحبؒ کی جدوجہد کا ایک بڑا شعبہ علم الکلام، مناظرہ اور عقائد کی وضاحت کا تھا۔امام صاحب کا دور تابعین کا دور تھا، اور یہ صحابہ کرام کے آخر کا زمانہ تھا۔ یہ وہ دور تھا جب اعتقاد کے فتنے سر اٹھانے شروع ہوئے تھے۔معتزلہ، خوارج، مرجئہ اور کرامیہ، یہ فتنے سر اٹھا رہے تھے۔کوئی ظاہر پرستی کی بنیاد پر اور کوئی عقل کی بنیاد پر۔ایک طرف خوارج کی ظاہر پرستی تھی اور دوسری طرف معتزلہ کی عقل پرستی۔دونوں انتہاء پر کھڑے تھے۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ نے جو کام کیا وہ فقہ کے اجتماعی مفہوم میں کیا۔ میں علماء کرام کی خدمت میں

ایک بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ امام صاحب کے دور میں فقہ کی یہ تعریف نہیں تھی کہ فقہ صرف احکام شرعیہ کا نام ہے۔ امام صاحبؒ نے فقہ کی جو تعریف کی ہے وہ صرف احکام پر موقوف نہیں ہے۔فقہ النفس مالها و ما علیها ، اس فقہ میں عقائد بھی تھے،اس میں وجدانیات بھی تھیں اور اس فقہ میں احکام بھی تھے۔فقہ النفس، فقہ الاحکام اور فقہ العقائد۔امام صاحبؒ جس فقہ کے فقیہ ہیں اور جس فقہ میں آپؒ نے کام کیا ہے وہ صرف احکام کی فقہ نہیں تھی بلکہ ایک کامل فقہ تھی۔

امام صاحب نے عقائد پر جو رسالہ لکھا ہے اس کا نام ہے 'الفقه الأكبر'۔ حضرت ملا علی قاریؒ نے اس کی بڑی اچھی شرح لکھی ہے۔ ہمارے چچا محترم حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتیؒ نے 'البیان الازہر' کے نام سے اس کا اردو ترجمہ کیا ہے جس پر حضرت والد صاحبؒ کا مقدمہ ہے۔ چنانچہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک فقہ کا سب سے بڑا شعبہ عقائد کی تشریح وتعبیر تھا۔فقہ کا دوسرا بڑا شعبہ احکام کا تھا، جسے عام طور پر ہمارے ہاں پوری فقہ سمجھا جاتا ہے۔اور پھر فقہ النفس کا شعبہ جسے وجدانیات کہتے ہیں، جسے تصوف کہتے ہیں، یہ بھی ہماری فقہ اور ہمارے نصاب کا حصہ تھا۔ تصوف، اخلاقیات، وجدانیات، دل کی کیفیات، عقیدے کے ساتھ دل کی صفائی، احوال کی وضاحت، یہ چیزیں بھی فقہ کا حصہ تھیں۔لیکن ہوا یہ کہ بعد میں عقائد نے علم الکلام کا رنگ اختیار کرلیا اور دوسرے معاملات نے تصوف کا روپ دھار لیا تو ہمارے ہاں یہ تقسیم پیدا ہوگئی۔میں اس بات کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ یہ تقسیم کہ احکام تو فقہ کے دائرے میں آتے ہیں،لیکن عقائد،تصوف و اخلاقیات، یہ فقہ سے الگ کوئی چیزیں ہیں،ایسا امام صاحب کے دور میں نہیں تھا۔امام صاحب کے ہاں یہ تمام شعبے دراصل فقہ کے شعبے ہی تھے۔التوضیح والتلویح ہماری اصولِ فقہ کی مرکزی کتاب ہے۔اس کتاب کا آغاز ہی اس بحث سے ہوتا ہے کہ امام صاحبؒ کے نزدیک فقہ صرف احکام اور معاملات کا نام نہیں ہے۔فقہ میں عقائد بھی شامل ہیں،فقہ میں تصوف بھی شامل ہے،اور فقہ میں احکام بھی شامل ہیں۔

امام ابوحنیفہؒ اور دینی تعلیم وتربیت

آج یہ بات عام طور پر کہی جاتی ہے کہ ہمارے ہاں مدارس میں تعلیم ہے لیکن تربیت نہیں ہے۔ گزشتہ دنوں مولانا مفتی رفیع عثمانی دامت برکاتہم ہمارے ہاں تشریف لائے ہوئے تھے۔انہوں

نے جامعہ قاسمیہ میں علماء کرام سے خطاب کرتے ہوئے ایک جملہ کہا کہ ''مدرسوں میں پڑھایا جاتا ہے، سکھایا نہیں جاتا''۔ یہ جملہ کہہ کر انہوں نے اس مسئلے کی بڑی اچھی وضاحت کی۔ ہمارے ہاں نہ عقائد کی تربیت منظّم ہے اور نہ فکری تربیت۔ کیف ما اتفق کہ معاملہ چل رہا ہے۔ چنانچہ ہماری اعتقادی اور فکری تربیت کا حال بھی یہی ہے۔ ہمارا حال خون کے الگ الگ گروپوں کی طرح ہے۔ جس کا گروپ جس شخصیت کے مزاج سے مل جاتا ہے تو بس وہ اسی کے ساتھ لگا رہتا ہے۔

کیا آپ کے خیال میں ہمارے مدارس میں فکری و اعتقادی تربیت ہو رہی ہے؟ اگر ہو رہی ہے تو کیا کسی پالیسی کے تحت ایک منظّم انداز میں ہو رہی ہے؟ اور پھر اخلاقی تربیت، اعمال کی تربیت، دل اور اس کی کیفیات کی تربیت۔ کیا آپ کو ہمارے ہاں یہ خلاء محسوس ہوتے ہیں یا نہیں؟ تو میری درخواست ہے کہ ہم حضرت امام صاحبؒ کی طرف واپس چلے جائیں۔ یعنی ہم فقہ کی اس تعریف کی طرف واپس چلے جائیں جو امام ابوحنیفہؒ نے کی، اور اسے ہم اپنے نصاب کا حصہ بنا لیں۔ ذہن کی اعتقادی وفکری تربیت کو بھی، اور دل کی اخلاقی وعملی تربیت کو بھی۔ آج ہم اپنے مدارس کے نظام میں جو جو خلاء محسوس کرتے ہیں، اس خلاء کو پُر کرنے کے لیے میں ایک تاریخ کے طالب علم کی حیثیت سے یہ سمجھتا ہوں کہ ہمیں امام صاحبؒ کی شخصیت کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور فقہ کی اس تعریف کو سامنے رکھ کر اپنے مسائل کا حل کرنا چاہیے جو امام صاحب نے کی۔ امام غزالیؒ بھی یہی واویلا کرتے دنیا سے رخصت ہوئے کہ بھئی فقہ کی اصل بات کی طرف آئیں۔ امام غزالیؒ نے اس پر پوری لڑائی لڑی ہے کہ یتفقہ فی الدین کا مطلب صرف قدوری پڑھنا نہیں ہے۔ یتفقہ میں عقائد، تربیت، اخلاق اور دین کے تمام شعبے شامل ہیں، اور فقہ دراصل پورے دین سے عبارت ہے۔

تو میں نے ایک بات یہ عرض کی ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے فقہ کے ایک عمومی دائرے میں کام کیا جس میں عقائد، احکام، اخلاقیات اور اصلاح نفس سب شامل ہیں۔ آج اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم بھی اس عمومی دائرے کی طرف واپس جائیں جو امام صاحبؒ نے بتایا تھا۔ اس کے بغیر ہمارے نظام کی اصلاح نہیں ہوگی اور ہم اپنی دینی تعلیمی ضروریات پوری نہیں کر پائیں گے۔

امام صاحبؒ کا اصولِ استدلال

دوسری بات یہ کہ امام صاحبؒ نے صرف احکام ومعاملات کی تشریح نہیں کی بلکہ عقائد میں بھی ہمیں ایک میزان دیا ہے۔ امام صاحبؒ کا اصولِ استدلال ہمارے سامنے بار بار آتا ہے۔ امام صاحبؒ نے یہ فرمایا ہے کہ میں سب سے پہلے مسئلہ لیتا ہوں قرآن سے، پھر سنت وحدیث سے اور پھر صحابہؓ سے۔ امام صاحبؒ فرماتے ہیں کہ میں صحابہؓ کے اقوال سے باہر نہیں نکلتا۔ یعنی صحابہؓ میں کسی مسئلے پر اختلاف ہو تو صحابہؓ ہی میں سے کسی کا قول لیتا ہوں، اور ان کے اقوال سے باہر نہیں نکلتا۔ جو بات یہاں وضاحت طلب ہے وہ یہ کہ امام صاحب کا یہ اصول استدلال صرف احکام و معاملات میں ہی میزان نہیں ہے بلکہ عقیدے کا میزان بھی یہی ہے اور اس سے بڑھ کر تصوف کا میزان بھی یہی ہے۔ یعنی عقائد، احکام، اخلاقیات وتربیت، فقہ النفس، اور دین کے دیگر تمام شعبوں میں امام صاحبؒ کا میزان یہی ہے۔

آج عقائد کی بحث ہے اور تصوف کے بھی بڑے میدان ہیں۔ آج یہ ضروری ہے کہ امام ابو حنیفہؒ نے جو توازن قائم کیا تھا، ہر شعبے میں اسی کو میزان مانا جائے۔ عقائد کی جو تعبیرات اس میزان پر پوری اترتی ہیں وہ صحیح ہیں اور جو پوری نہیں اترتی وہ صحیح نہیں ہیں۔ اہل السنّت والجماعت کا معنٰی یہی ہے کہ عقائد واحکام کی جو تعبیرات وتشریحات امام صاحبؒ کے اس میزان پر پوری اترتی ہیں وہ اہل السنّت والجماعت کے عقائد ہیں اور جو پوری نہیں اترتی وہ اہل السنّت والجماعت کے عقائد نہیں ہیں۔ اسی طرح تصوف واخلاقیات میں بھی جو کچھ امام صاحبؒ کے اس میزان پر پورا اترتا ہے وہ صحیح ہے، اور جو پورا نہیں اترتا وہ صحیح نہیں ہے۔

وحی الٰہی کی روشنی میں عقل کا استعمال

معتزلہ اور خوارج کی دو انتہاؤں کے درمیان امام صاحبؒ نے ایک توازن قائم کرتے ہوئے بتایا کہ ہماری بنیاد قرآن وحدیث کے نصوص پر ہوگی اور نصوص کی تفہیم میں ہم عقل کا استعمال بھی کریں گے۔ لیکن ہماری ضرورت عقل کو استعمال کرنا ہے، عقل کے ہاتھوں استعمال ہونا نہیں ہے۔ ہم یہ بات بالکل تسلیم کرتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ ایک صاحب الرائے ہیں۔ امام صاحبؒ رائے،

عقل اور قیاس کی بات کرتے ہیں۔ لیکن امام صاحبؒ عقل کو استعمال کرنے کی بات کرتے ہیں، اور جہاں عقل کے ہاتھوں استعمال ہونے کی نوبت آتی ہے، وہاں وہ قرآن وسنت اور صحابہؓ کی پناہ لیتے ہیں۔ یعنی بنیاد نصوص پر ہے جن میں تین باتیں شامل ہیں۔ قرآن، حدیث اور تعامل وآثارِ صحابہؓ۔ چنانچہ تعبیر وتشریح میں ہم عقل کی نفی بالکل نہیں کرتے۔ ہم عقل کا استعمال کرتے ہیں، اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور عقل کا ایک جائز مقام ہے۔

فقہ حنفی کی مقبولیت کی وجہ

اب میں تیسری اور آخری بات عرض کرنا چاہوں گا۔ ذرا غور فرمایئے کہ اللہ رب العزت نے امام اعظمؒ کی دین کی تعبیر کو کتنی عظمت عطا فرمائی ہے۔ اہل سنت کے اندر بھی عقائد کی تعبیر کے حوالے سے بڑے مکاتب فکر ہیں۔ اشاعرہ ہیں، ماتریدیہ ہیں، ظواہر ہیں۔ لیکن اللہ رب العزت نے یہ مقبولیت اور یہ مقام امام ابوحنیفہؒ کو عطا فرمایا ہے کہ آج کے دور میں بھی، تمام تر داخلی اختلافات کے باوجود عقائد اور عقائد کی تعبیر وتشریح میں امام ابوحنیفہؒ ہی سند سمجھے جاتے ہیں۔ دنیا میں، عقیدے کے باب میں سب سے زیادہ پڑھائی جانے والی کتاب ''العقیدۃ الطحاویہ'' جو ایک بڑے حنفی فقیہ ومحدث حضرت امام طحاویؒ کی تصنیف ہے۔ کوئی ابوحنیفہؒ کو اپنا امام مانتا ہے، وہ بھی اسی کتاب کو پڑھاتا ہے اور جو ابوحنیفہ کو اپنا امام نہیں مانتا وہ بھی یہی کتاب پڑھاتا ہے۔ آج کی دنیا میں اہل سنت کے عقائد کی سب سے متوازن تعبیر کی سب سے متوازن کتاب جو پڑھی اور پڑھائی جاتی ہے وہ 'العقیدۃ الطحاویہ' ہے۔ حنابلہ بھی پڑھاتے ہیں، ظواہر بھی پڑھاتے ہیں اور شافعی بھی پڑھاتے ہیں۔ مکہ مکرمہ میں بھی یہ کتاب پڑھائی جاتی ہے اور یہاں آپ کے شہر میں بھی یہی کتاب پڑھائی جاتی ہے۔ آج یہ اعزاز اللہ تعالیٰ نے امام ابوحنیفہؒ کو دیا ہے کہ تمام تر داخلی اختلافات و تعبیرات کے فرق کے باوجود دنیائے اہل سنت کے مختلف دائروں میں عقائد کی سب سے زیادہ مستند کتاب 'العقیدۃ الطحاویہ' سمجھی جاتی ہے۔

ایک بات اور بھی آپ کی خدمت میں عرض کر دوں، جو شاید پہلے ہی آپ کے مطالعہ میں ہوگی۔ مغربی ممالک میں تو سب سے زیادہ 'العقیدۃ الطحاویہ' پڑھائی جاتی ہے۔ لیکن یہ جو مشرقی پٹی ہے، انڈونیشیا اور ملائیشیا وغیرہ، یہ سب شوافع ہیں۔ اور شوافع ہمارے بھائی ہیں۔ حضرت امام شافعیؒ

کے مقلدین دنیا میں تیس کروڑ سے زیادہ ہیں۔ بمبئی سے آگے نکل جائیں، سارے شوافع ہی ہیں۔ ایسٹ کی پٹی میں اکثریت شوافع کی ہے۔ لیکن شوافع کی اس ساری پٹی میں فقیہ ابواللیث سمرقندیؒ کی کتاب 'العقیدہ' سب سے زیادہ پڑھائی جاتی ہے۔ امام طحاویؒ تیسری صدی ہجری کے ہیں جبکہ ابو اللیث سمرقندیؒ چوتھی صدی ہجری کے ہیں۔ دونوں حنفی بزرگ ہیں۔

گفتگو کا خلاصہ

اس وقت امام صاحبؒ کے مناظروں کی تفصیل میں جانے کا وقت نہیں ہے لیکن میں نے امام صاحبؒ کی جدوجہد کے حوالے سے چند باتیں آپ کی خدمت میں عرض کی ہیں۔ پہلی بات میں نے یہ عرض کی کہ امام صاحبؒ کی فقہ ایک جامع اور مکمل فقہ ہے۔ فقہ حنفی صرف احکام شرعیہ کا نام ہی نہیں ہے بلکہ یہ دین کے تمام شعبوں کا احاطہ کرتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ امام صاحب نے عقل وفکر اور وحی الٰہی کی کشمکش کے تناظر میں ایسا میزان قائم کیا کہ ان کے دور میں بھی دنیا نے اس میزان کو تسلیم کیا اور آج کی دنیا میں بھی اس میزان کو تسلیم کیا جارہا ہے۔ تیسری بات میں نے یہ عرض کی کہ یہ اعزاز بھی امام ابوحنیفہؒ کا ہے کہ آج کی دنیا میں بھی اور آج کے مدارس میں بھی ایک طرف عقیدے کے باب میں سب سے زیادہ پڑھائی جانے والی کتاب 'العقیدۃ الطحاویہ' ہے، جبکہ دوسری طرف مشرق بعید کی پوری پٹی میں عقیدے کی پڑھائی جانے والی کتاب 'العقیدہ' ہے۔ ان دونوں کتابوں کے مصنفین حنفی مکتب فکر کے عالم تھے۔ اللہ رب العزت نے اہل سنت کے عقائد کی وضاحت میں اور علم الکلام کی تشریحات وتعبیرات میں امام صاحبؒ کو اور ان کے شاگردوں کو یہ اعزاز عطا کیا ہے۔ اللہ کرے کہ ہم بھی اس سے کچھ استفادہ کرسکیں اور ہم بھی اس معاملے میں کوئی خدمت سر انجام دے سکیں۔ وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین۔

امام اعظمؒ کی تعلیمات اور عصرِ حاضر

۱۱ دسمبر ۲۰۱۱ء کو لوئر مال لاہور کے عامر ہوٹل میں ''اتحاد اہل سنت'' کے زیر انتظام ''امام اعظم ابوحنیفہؒ سیمینار'' منعقد ہوا جس کا اہتمام حضرت مولانا خواجہ خان محمدؒ آف کندیاں شریف کی یاد میں کیا گیا تھا۔ مولانا محمد الیاس گھمن سیمینار کے داعی و منتظم اور مولانا عبدالشکور حقانی اسٹیج سیکرٹری تھے۔ لاہور کے علماء کرام اور دینی کارکنوں کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی جبکہ خطاب کرنے والوں میں حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود، مولانا حافظ فضل الرحیم، مولانا محبّ اللہ آف لورائی، مولانا محمد الیاس گھمن، الحاج سید سلیمان گیلانی اور دیگر سرکردہ حضرات شامل تھے۔ حضرت امام اعظمؒ کو منظوم خراج عقیدت بھی پیش کیا گیا جبکہ حضرت خواجہ خان محمدؒ کے فرزند صاحبزادہ مولانا خواجہ رشید احمد دیگر علماء کرام کے ساتھ اسٹیج پر رونق افروز تھے اور حضرت مولانا عبدالغفور آف ٹیکسلا کی دعا پر سیمینار کا اختتام ہوا۔ راقم الحروف نے اس موقع پر جو گزارشات پیش کیں ان کا خلاصہ نذر قارئین کیا جا رہا ہے۔

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علیٰ سید المرسلین وعلیٰ الہ واصحابہ واتباعہ اجمعین. اما بعد.

مولانا محمد الیاس گھمن اور ان کے رفقاء شکریہ اور مبارکباد کے مستحق ہیں کہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی یاد میں وقتاً فوقتاً سیمینار منعقد کر کے ہمیں عالم اسلام کی اس عظیم علمی و دینی شخصیت کی یاد دلاتے ہیں اور ان سے راہنمائی حاصل کرنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ اپنے اسلاف کو یاد کرتے رہنا ہماری دینی وفکری ضرورت ہے اور امام اعظم ابوحنیفہؒ کے بارے میں تو میری طالبعلمانہ رائے یہ ہے کہ آج کی دنیا کے مسائل حل کرنے اور علمی وفکری مشکلات میں راہنمائی کے لیے امام اعظم ابوحنیفہؒ کی تعلیمات اور فکر و جہد کو اجاگر کرنا وقت کی سب سے اہم ضرورت ہے۔ حضرت امام اعظمؒ کے بارے میں گفتگو کے بیسیوں پہلو ہیں جن پر بات کی جا سکتی ہے اور جن کے بارے میں گفتگو کی

ضرورت ہے مگر میں ان سے صرف ایک دو پہلوؤں پر اپنے ذوق کے مطابق کچھ عرض کرنا چاہوں گا۔ اور اس کے لیے تاریخ کے ایک اہم سوال پر بات کروں گا کہ امام اعظمؒ نے قاضی القضاۃ کے جس منصب کو قبول نہیں کیا تھا اور اس سے انکار پر اپنی جان کا نذرانہ بھی پیش کر دیا تھا، قاضی القضاۃ کے اسی منصب کو ان کے جانشین حضرت امام ابو یوسفؒ نے کیوں قبول کر لیا تھا اور وہ خلیفہ ہارون الرشید کے دورِ حکومت میں قاضی القضاۃ کی حیثیت سے خدمات کیوں سرانجام دیتے رہے؟

امام ابوحنیفہؒ نے قاضی القضاۃ کا منصب کیوں قبول نہیں کیا؟

تاریخ کے ایک طالب علم کے طور پر اس سوال کا جائزہ لینے کی کوشش کروں گا۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات قابل توجہ یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے جس وقت علمی دنیا میں قدم رکھا وہ دور کونسا تھا اور اس وقت حالات کا عمومی تناظر کیا تھا؟ امام ابوحنیفہؒ کا سن ولادت ۸۰ھ ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ امیر المومنین حضرت عمر بن عبد العزیزؒ اڑھائی سال حکومت کرنے کے بعد جب اپنوں کے ہاتھوں ہی زہر کھا کر شہید ہوئے تو اس وقت امام ابوحنیفہؒ کی عمر اکیس بائیس سال کے لگ بھگ تھی اور یہ ان کا علمی وعملی دور میں قدم رکھنے کا ابتدائی زمانہ تھا۔ یہی وہ دور ہوتا ہے جب کسی انسان کی زندگی کے عملی اہداف طے ہوتے ہیں، اس کی زندگی بھر کی تگ ودو کا رخ متعین ہوتا ہے اور اس کے مستقبل کی صورت گری واضح شکل اختیار کرتی ہے۔

امام اعظمؒ کی توجہ کا سبب

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کو ''عمر ثانی'' کہا جاتا ہے اور وہ عمر ثانی ہی تھے، ان کی خلافت کو خلافتِ راشدہ کا تتمہ کہا جاتا ہے اور ان کا دور حکومت فی الواقع خلافت راشدہ کا عکس اور پرتو تھا۔ ان کی اڑھائی سالہ مختصر حکومت کے دوران کی گئی اصلاحات کو آج تک تاریخ میں سنہرے الفاظ میں یاد کیا جاتا ہے اور ان کے طرز حکومت کو ایک آئیڈیل طرز حکومت تصور کیا جاتا ہے، لیکن ان کی شہادت کے بعد خود ان کے جانشین یزید بن عبد الملک نے خلیفہ بنتے ہی اپنے عُمال کو جو ہدایت جاری کی تھی اس میں اس نے کہا تھا:

> ''واضح ہو کہ عمر بن عبد العزیزؒ ایک فریب خوردہ شخص تھا، تم نے اور تمہارے ساتھیوں نے اسے خوب دھوکے میں ڈالا۔ اب جونہی میرا یہ فرمان

تمہارے پاس پہنچے، یکلخت ان تمام طریقوں کو ترک کر دو جو اَب تک تم عمرؓ کے عہد کی چیزوں کے متعلق جانتے تھے، لوگوں کو پہلی حالت کی طرف واپس لوٹا دو، خواہ سرسبزی کا زمانہ ہو یا خشک سالی کا، لوگ اسے پسند کریں یا ناپسند، جئیں یا مریں۔'' (بحوالہ عقد الفرید)

اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہوسکتا ہے کہ حالات کو بہتر بنانے، نظام حکومت کی اصلاح اور طرز حکمرانی کو خلافت راشدہ کی طرز پر واپس لے جانے کی جو امیدیں اہلِ خیر کے دلوں میں کسی حد تک اس دور میں موجود تھیں اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے امید کے اس چراغ کو اپنا لہو دے کر جس طرح روشن کرنا چاہا تھا وہ ٹوٹ گئی تھیں اور حالات اب کسی اور طرز کی جدوجہد کا تقاضا کرنے لگے تھے۔ میری طالبعلمانہ رائے یہ ہے کہ اسی صورتحال نے امام اعظم ابوحنیفہؒ کو ایک ایسی محنت کی طرف متوجہ کیا جو مستقبل میں نظام حکومت اور عمومی معاشرت کے حوالہ سے اصلاح کی ٹھوس بنیاد بن سکے اور وہ علمی محنت تھی جس میں امام صاحبؒ نے اسلامی قوانین کی تعبیر وتشریح اور ان کی قانونی ترتیب کے لیے فقہی مجلس قائم کی اور کم وبیش ۴۰ اہل علم کے ساتھ مل کر شریعت اسلامیہ کے ۸۰ ہزار سے زائد مسائل واحکام مرتب کر دیے۔

ایک مدون ذخیرۂ قوانین کی ضرورت

قانون کی ایسی تشریح کہ مختلف صورتیں فرض کر کے ان کے لیے قوانین بیان کیے جائیں اس سے پہلے ''فقہ فرضی'' کہلاتی تھی اور نہ صرف یہ کہ اس کا عمومی رواج نہیں تھا بلکہ صحابہ کرامؓ میں سے بعض بزرگ اسے پسند بھی نہیں کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ جب تک کوئی واقعہ یا مسئلہ عملاً پیش نہ آجائے اس کے بارے میں شرعی حکم دریافت کرنا تکلف اور غیر ضروری بات ہے، مگر امام ابوحنیفہؒ نے یہ دیکھا کہ شرعی قوانین کا مدوّن اور بنیادی ذخیرہ صحابہ کرامؓ اور تابعین کے اس دور میں ہی مرتب ہوجائے گا تو بہتر ہوگا ورنہ اگر آنے والے ہر زمانے کے لوگوں اور قاضیوں کی صوابدید پر یہ بات چھوڑ دی گئی تو شرعی قوانین کی صحیح اور محفوظ تشریح خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ اسی لیے انہوں نے اہل علم کی مجلس قائم کی، علمی مسائل پر باہمی بحث ومباحثہ کا ذوق پیدا کیا، قرآن وسنت اور آثار صحابہؓ کو بنیاد بنا کر قوانین کی تدوین اور احکام شرعیہ کی تعبیر وتشریح کے عظیم کام کا آغاز کیا، اور باہمی علمی

مشاورت کے ساتھ ۸۰ ہزار سے زائد قوانین مدوّن کر کے امت کے حوالے کر دیے جو عبادات و معاملات سمیت زندگی کے ہر شعبہ کے بارے میں تھے تاکہ بعد میں آنے والوں کے پاس ایک عظیم الشان علمی وفقہی ذخیرہ موجود ہو اور امت کے عدالتی نظام کو علمی وفقہی بنیاد فراہم ہو جائے۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ اس کے بعد خلافت عباسیہ، خلافت عثمانیہ اور مغل سلطنت سمیت کسی بھی بڑی حکومت کو اسلامی اصولوں کے مطابق عدالتی نظام چلانے کے لیے علمی مواد اور فقہی ذخیرے کی ضرورت پڑی تو فقہ حنفی نے آسانی کے ساتھ ہر دور میں اس ضرورت کو پورا کر دیا۔ یہ ''فقہ فرضی'' جس کی تشکیل کو امام ابوحنیفہؒ اور ان کے رفقاء نے باقاعدہ اور اجتماعی حیثیت دی، آج کے دور میں ''قانون سازی'' کہلاتی ہے۔

آج جب نفاذ اسلام کی بات ہوتی ہے تو ایک عام سا سوال ضرور سامنے آتا ہے کہ کیا اسلام میں قانون سازی کی گنجائش ہے اور کیا ایک اسلامی حکومت میں قانون سازی کی ضرورت ہوتی ہے؟ میں عرض کیا کرتا ہوں کہ یہی قانون سازی تھی جو امام اعظم ابوحنیفہؒ اور ان کے رفقاء نے کی اور اسی قانون سازی پر بارہ سو سال تک امت کے عدالتی سسٹم اور معاشرتی نظام کی عمارت استوار رہی ہے۔ بلکہ میں اس سے اگلی بات کروں گا کہ اسلامی ریاست کے لیے باقاعدہ تحریری دستور بھی سب سے پہلے امیر المومنین ہارون الرشید کے دور حکومت میں ان کی فرمائش پر حضرت امام ابو یوسفؒ نے لکھا جو ''کتاب الخراج'' کی صورت میں آج بھی ہماری لائبریریوں میں موجود ہے۔ یہ کتاب الخراج اگرچہ زیادہ تر مالی معاملات کے حوالے سے لکھی گئی تھی لیکن اسے مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اس دور کے حوالے سے یہ دستور حکومت ہی تھا جو امیر المومنین کی فرمائش پر لکھا گیا اور وہ عباسی حکومت میں عملاً نافذ رہا۔ اس لیے میرے خیال میں امام ابوحنیفہؒ نے پہلا بڑا کام یہ کیا کہ قرآن و سنت اور آثار صحابہؓ کی روشنی میں اسلامی قوانین کا ایک بڑا ذخیرہ علماء کی باہمی مشاورت کے ساتھ مرتب کر دیا جو اَب تک امت کے کام آ رہا ہے اور قیامت تک کام آتا رہے گا۔

نفاذ وعملداری کے لیے رجال سازی کی ضرورت

قوانین کی ترتیب وتدوین کے بعد امام اعظمؒ کا دوسرا بڑا کام ''رجال سازی'' تھا کہ انہوں نے ان قوانین کے نفاذ اور عملداری کے لیے رجال کار تیار کیے۔ اس سلسلہ میں تفصیلات میں جائے بغیر

امام ابوحنیفہؒ کے اس خطبے کے کچھ حصے آپ کے سامنے پیش کرنا چاہوں گا جوانہوں نے کوفہ کی جامع مسجد میں اپنے شاگردوں کے ایک ہزار کے لگ بھگ اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا۔اس اجتماع کی تفصیل اور خطاب کے اقتباسات حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے اپنی کتاب ''امام اعظم ابوحنیفہؒ کی سیاسی زندگی'' میں نقل کیے ہیں۔امام اعظمؒ نے اپنے ہزاروں تلامذہ سے فرمایا کہ:

''میرے دل کی مسرتوں کا سرمایہ صرف تم لوگوں کا وجود ہے،تمہاری ہستیوں میں میرے حزن اور غم کے ازالے کی ضمانت پوشیدہ ہے۔''

''فقہ کی زین تم لوگوں کے لیے کس کر میں تیار کر چکا ہوں،اس کے منہ پر تمہارے لیے لگام بھی چڑھا چکا ہوں،اب تمہارا جس وقت جی چاہے اس پر سوار ہو سکتے ہو،میں نے ایک ایسا ماحول پیدا کر دیا ہے کہ لوگ تمہارے نقش قدم کی جستجو کریں گے اور اسی پر چلیں گے،تمہارے ایک ایک لفظ کو لوگ اب تلاش کریں گے،میں نے گردنوں کو تمہارے لیے جھکا دیا ہے اور ہموار کر دیا ہے۔''

پھر ان میں سے چالیس حضرات کو اپنے قریب بلا کر ان سے بطور خاص حضرت الامامؒ نے فرمایا کہ:

''پس اب وقت آ گیا ہے کہ آپ لوگ میری مدد کریں،میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم (چالیس) میں ہر ایک عہدۂ قضا کی ذمہ داریوں کو سنبھالنے کی پوری صلاحیت اپنے اندر پیدا کر چکا ہے،اور دس آدمی تو تم میں ایسے ہیں جو صرف قاضی ہی نہیں بلکہ قاضیوں کی تربیت وتادیب کا کام بھی بخوبی سرانجام دے سکتے ہیں۔''

اسی سے امام اعظمؒ کا وہ حزن وملال سمجھا جا سکتا ہے جس کے ازالے کے لیے انہوں نے اتنی عظیم الشان عملی محنت کی،قوانین کا ذخیرہ مرتب کیا اور ان پر عملدرآمد اور ان کے نفاذ کی صلاحیت رکھنے والے قاضی تیار کر کے امت کے حوالے کیے،اور پھر تاریخ گواہی دیتی ہے کہ امام ابوحنیفہؒ

کے اسی حزن وملال اوراس کے ازالے کے لیے ان کی اس علمی محنت پر بارہ سوسال تک امت کے عدالتی نظام کی عمارت پورے استحکام سے کھڑی رہی، اور تاریخ کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ مسلمانوں کا سیاسی نظام مختلف ادوار میں اچھا برا جیسا بھی رہا ہو، مگر عدالتی نظام ہمیشہ آزاد، باوقار اور مستحکم رہا ہے، اور تاریخ کے میرے جیسے طالب علم کو اس سب کچھ کے پیچھے امام اعظم ابوحنیفہؒ کی شخصیت کھڑی دکھائی دیتی ہے۔

میرے خیال میں ان گزارشات میں اس سوال کا جواب بھی آپ کو مل گیا ہوگا کہ امام ابوحنیفہؒ نے خود قاضی القضاۃ کا منصب کیوں قبول نہیں کیا اور ان کے شہید ہو جانے کے بعد ان کے جانشین امام ابو یوسفؒ نے وہی منصب کیوں قبول کر لیا جس سے انکار پر ان کے استاذ محترم نے اپنی جان تک قربان کر دی تھی۔ امام صاحبؒ نے خود یہ منصب قبول نہیں کیا اس لیے کہ ان کے نزدیک منصب سے زیادہ اس کام کی اہمیت تھی جو انہوں نے سرانجام دیا کیونکہ وہ یہ سمجھ چکے تھے قوانین کی ترتیب وتدوین اور علمی ماخذ ومواد کی فراہمی کے بغیر (جسے آج کی زبان میں ہوم ورک اور پیپر ورک کہا جاتا ہے) نفاذ اسلام کا کام آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اسی طرح انہوں نے صرف قوانین ونظام مدوّن کر کے نہیں دیے بلکہ اس کے لیے تربیت یافتہ اور باصلاحیت رجال کار بھی تیار کیے کیونکہ اہل، باصلاحیت اور مخلص رجال کار کے بغیر کوئی بھی نظام یا قوانین اپنے نفاذ اور عملداری کے ثمرات حاصل نہیں کر سکتے۔

پاکستان میں نفاذِ اسلام کے لیے رجال سازی

اس پر دور حاضر کا ایک واقعہ بھی عرض کر دوں تو بات جلدی سمجھ میں آجائے گی۔ اب سے ربع صدی قبل جب ہم سینٹ آف پاکستان میں مولانا قاضی عبداللطیفؒ اور مولانا سمیع الحقؒ کے پیش کردہ شریعت بل کے لیے ملک بھر میں جدوجہد کر رہے تھے، عوامی جلسے اور ریلیاں ملک کے ہر علاقے میں منعقد ہو رہی تھیں، ہر طرف ہلا گلا تھا اور میں بھی اس تحریک میں پیش پیش تھا۔ اس زمانے میں گوجرانوالہ ڈویژن کے کمشنر جناب غلام مرتضیٰ پراچہ تھے جو پرانے اور تجربہ کار بیوروکریٹ اور سمجھدار افسر تھے۔ ایک محفل میں ان سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ مولوی صاحبان! آپ حضرات یہ کیا ہلاّ گلاّ کر رہے ہیں؟ میں نے کہا کہ نفاذ شریعت کے لیے

جدوجہد کررہے ہیں۔انہوں نے پوچھا کہ کیسے نافذ کریں گے؟ میں نے کہا کہ رائے عامہ کے دباؤ کے ساتھ اسمبلی سے ''شریعت بل'' منظور کرائیں گے جو نافذ ہوجائے گا۔انہوں نے پوچھا کہ عمل کس کے ذریعے کراؤ گے، اس لیے کہ اس وقت تو میرے جیسے افسروں کے ہاتھ میں ملک میں کا کنٹرول ہے،عمل تو ہم نے کروانا ہے، اگر آپ مولوی صاحبان کا خیال ہے کہ میرے جیسے افسران کے ذریعے آپ ملک میں اسلام کا قانون ونظام نافذ کرلیں گے تو یہ بات بھول جائیں، یہ نہیں ہوگا۔مثلاً گوجرانوالہ ڈویژن کے تمام اضلاع میرے ماتحت ہیں یہاں جو کچھ ہونا ہے میرے ذریعے ہونا ہے، اس لیے مولوی صاحب! اگر میری جگہ پر بٹھانے کے لیے آپ کے پاس متبادل آدمی ہے تو اسلام کی بات کریں ورنہ خوامخواہ لوگوں کا وقت ضائع نہ کریں۔

اس وقت تو پراچہ صاحب کی بات میں نے جوش وجذبات میں سنی اَن سنی کردی لیکن بعد میں جوں جوں غور کرتا گیا یہ حقیقت کھلتی چلی گئی اور حضرت امام اعظمؒ کے حالات کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات شرح صدر کے ساتھ سمجھ میں آگئی، اس لیے کہ امام صاحبؒ نے مناصب کی خانہ پری کرنے کی بجائے قوانین کی تدوین کے ہوم ورک اور ان کے لیے رجال کار کی تیاری وفراہمی کی محنت کو ترجیح دی تھی جس کے ثمرات سے امت کا نظام عدل بارہ سو سال تک مجموعی طور پر مستفید ہوتا رہا، جبکہ اہل علم آج بھی اس سے برابر مستفید ہورہے ہیں۔اسی وجہ سے میری طالبعلمانہ رائے میں حضرت امام اعظمؒ کی یہی فراست وتدبر نفاذ اسلام کے لیے آج کے دور میں ہماری سب سے زیادہ راہنمائی کرسکتا ہے۔

امام اعظمؒ آج کے حالات میں کیا کرتے؟

دوسرا سوال جس کا میں آج کے سیمینار میں جائزہ لینا چاہتا ہوں، یہ ہے کہ آج اگر بالفرض امام اعظمؒ ہمارے درمیان موجود ہوتے تو ان معروضی حالات میں وہ کیا کرتے؟ یا دوسرے لفظوں میں ہم آج کے زمینی حقائق اور معروضی حالات میں حضرت امام اعظمؒ سے کیا راہنمائی حاصل کرسکتے ہیں؟ میں اس سلسلہ میں بہت سی تفصیلات کو نظرانداز کرتے ہوئے چند گزارشات عرض کرنا چاہتا ہوں۔

(۱) دینی تحریکات کی سرپرستی

پہلی بات یہ ہے کہ اگر امام ابوحنیفہؒ آج کے حالات میں موجود ہوتے تو میرے ناقص مطالعہ و معلومات کے مطابق وہ دینی تحریکات کے سب سے بڑے سرپرست ہوتے۔ اس لیے کہ امام صاحبؒ نے اصلاح نظام اور شرعی قوانین کے نفاذ کے لیے صرف علمی کام ہی نہیں کیا بلکہ اپنے دور کی دینی تحریکات کی سرپرستی اور انہیں سپورٹ بھی کرتے رہے۔ حضرت امام زید بن علیؒ، امام ابراہیم نفس زکیہؒ کی تحریکات اس دور میں حکومت ونظام کی تبدیلی اور طرز حکومت کی اصلاح کی تحریکات تھیں جنہیں حضرت امام اعظمؒ کی بھرپور حمایت حاصل تھی۔ امام ابوحنیفہؒ براہ راست ان تحریکات میں شریک نہیں ہوئے اور حریف بن کر حکومتوں کے سامنے نہیں آئے لیکن

(۱) مذکورہ دینی تحریکات کو انہوں نے مالی، اخلاقی اور سیاسی ہر لحاظ سے سپورٹ کیا اور ان کے ساتھ ساتھ ان کی علمی وفکری راہنمائی بھی فرمائی۔

(۲) حکومتوں کے غلط اقدامات پر کھلم کھلا تنقید کرتے رہے جس کی پاداش میں انہیں مختلف اوقات میں کوڑوں اور قید کی سزا بھی بھگتنا پڑی۔

(۳) انہوں نے حکمرانوں کے ساتھ اجتماعی مصالح کے لیے باوقار سطح پر تعلقات برقرار رکھے ہیں لیکن کوئی منصب قبول کر کے حکومتی نظام کا حصہ بننے سے مسلسل گریز کیا۔

امام اعظم ابوحنیفہؒ کی یہ زندگی اور جدوجہد آج بھی دینی وعلمی قیادت سے اسی قسم کے باوقار، مدبرانہ، بے نیازانہ، جرأت مندانہ اور پرحوصلہ کردار کی توقع رکھتی ہے۔

(۲) اجتماعی مشاورت کا نظم

دوسرے نمبر پر میں عرض کرنا چاہوں گا کہ امام اعظمؒ نے علمی وفقہی مسائل میں اجتماعی علمی مشاورت کی بنیاد رکھ کر ہمیں یہ سبق دیا ہے کہ فقہی مسائل واحکام کی قرآن وسنت سے قریب تر تعبیر و تشریح کا صحیح راستہ اجتماعی مشاورت اور کھلا علمی مباحثہ و مکالمہ ہے۔ امام صاحبؒ کی فقہی مجلس مشاورت کے طریق کار کو دیکھ لیجئے کہ استاذ محترم کے سامنے بیٹھ کر ان کے شاگرد اُن کی رائے سے اختلاف کر رہے ہیں اور ایک مسئلہ پر کئی کئی روز بحث ہو رہی ہے۔ امام صاحبؒ کسی شاگرد پر اپنی استاذیت کا دباؤ نہیں ڈال رہے اور کھلے دل سے اختلاف اور مباحثے کی حوصلہ افزائی کر رہے

ہیں۔ حتٰی کہ مجلس کے فیصلے لکھواتے وقت اگر کسی شاگرد کو اپنے استاذ یا مجلس کے فیصلے سے اتفاق نہیں ہے تو اسے اپنی الگ رائے، جسے ہم اختلافی نوٹ کا عنوان دیا کرتے ہیں، لکھوانے کا حق بھی حاصل ہے۔ چنانچہ فقہ حنفی کے ذخیرے میں ہمیں امام زفرؒ، امام حسنؒ اور دیگر ائمہ کے الگ اقوال ان کے حوالے سے آج بھی مذکور ملتے ہیں جو اُن کی جداگانہ رائے کے طور پر درج کیے گئے تھے۔ اس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ قابل توجہ ہے جو مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے امام جرجانیؒ کے حوالے سے ان الفاظ میں درج کیا ہے کہ:

''الجرجانی کہتے ہیں کہ میں امام کی مجلس میں حاضر تھا کہ ایک نوجوان نے جو اسی حلقہ میں بیٹھا ہوا تھا امام صاحبؒ سے سوال کیا جس کا امام صاحبؒ نے جواب دیا۔ لیکن نوجوان کو میں نے دیکھا کہ جواب کو سنتے ہی بے تحاشا وہ امام کو مخاطب کر کے کہہ رہا ہے کہ ''اخطئت'' آپ نے غلطی کی ہے۔ جرجانیؒ کہتے ہیں کہ نوجوان کے اس طرز گفتگو کو دیکھ کر میں حیران ہو گیا اور حلقہ والوں سے خطاب کر کے میں نے کہا کہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ استاذ کے احترام کا تم لوگ بالکل لحاظ نہیں کرتے۔ مگر جرجانیؒ ابھی اپنی نصیحت کو پوری کرنے بھی نہ پائے تھے کہ وہ سن رہے تھے کہ امام صاحبؒ فرما رہے ہیں کہ ''دعهم فانی قد عودتهم ذلك من نفسی'' تم ان لوگوں کو چھوڑ دو میں نے خود ہی اس طرز کلام کا انہیں عادی بنایا ہے۔''

اس لیے میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ اگر امام صاحب آج کے دور میں ہوتے تو علمی وفقہی مسائل میں اجتماعی مشاورت کا اہتمام کرتے، فقہی احکام پر کھلے مباحثے کی تلقین کرتے، اس کی حوصلہ افزائی کرتے اور محدود فقہی حلقوں کو اجتماعی مشاورت کا راستہ دکھاتے۔ اسی بنیاد پر میں ایک بات عام طور پر عرض کیا کرتا ہوں کہ حنفی فقہ شخصی فقہ نہیں بلکہ مشاورتی اور اجتماعی فقہ ہے جسے ایک اچھی خاصی علمی مجلس نے باہمی مشاورت اور کھلے علمی مباحثے کے ذریعے حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کی سربراہی میں مدون ومرتب کیا ہے۔

(۳) بدعنوانی سے پاک معاشرہ

اس سلسلہ میں تیسری گزارش میں یہ کرنا چاہوں گا کہ آج ہمارا بڑا قومی مسئلہ کرپشن، نااہلی اور بد دیانتی کا بتایا جاتا ہے۔ کرپشن ہمارے مزاج کا حصہ بنتی جارہی ہے اور دیانت وامانت کو بے وقوفی اور نارسائی سمجھا جانے لگا ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ کی ذاتی زندگی اور ان کی امانت و دیانت اس بارے میں ہماری راہنمائی کرتی ہے اور ہمارے لیے اسوہ اور آئیڈیل کی حیثیت رکھتی ہے۔ انہوں نے دیانت وامانت کا ایسا اعلیٰ معیار دنیا کے سامنے پیش کیا ہے جسے دیکھ اور اپنا کر کرپشن اور بد دیانتی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا جاسکتا ہے۔ اس کے بیسیوں واقعات میں سے صرف ایک کا تذکرہ بطور نمونہ کروں گا کہ امام ابوحنیفہؒ ایک بیمار دوست کی بیمار پرسی کے لیے اس کے گھر گئے جو اُن کے وہاں بیٹھے بیٹھے فوت ہوگیا۔ اس کے فوت ہونے کے بعد امام صاحبؒ نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے سامنے جلتے ہوئے دیے کو پھونک مار کر بجھا دیا اور ایک دوست کو پیسے دیے کہ بازار سے نیا دیا لاکر یہاں جلا دو۔ لوگوں نے وجہ پوچھی تو فرمایا کہ اس کی زندگی میں یہ دیا اس کی ملکیت تھا اور ہم اس کے مہمان تھے مگر اس کے مرنے کے بعد یہ دیا اس کے ورثاء کی مشترکہ ملکیت میں چلا گیا ہے اور مشترکہ چیز کو شرکاء کی اجازت کے بغیر استعمال کرنے کو میں پسند نہیں کرتا۔

آج کرپشن کے خاتمے اور اس کی حوصلہ شکنی کے لیے اسی قسم کے کردار کو سامنے لانے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں آج کے حالات میں امام اعظمؒ سے صحیح راہنمائی حاصل کرنے کی توفیق دے، آمین یارب العالمین۔

امام ابوحنیفہؒ اور عقائد وتعبیراتِ اہل سنت

۲۲ جنوری ۲۰۱۲ء کو شادمان میرج ہال گوجرانوالہ میں اتحاد اہل سنت پاکستان کے زیر اہتمام ''امام ابوحنیفہؒ سیمینار'' ہوا جس میں حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود، مولانا عبدالحق خان بشیر، مولانا محمد الیاس گھمن، الحاج سید سلمان گیلانی، مولانا مقصود حنفی، مفتی محمد نعمان، قاری محمد ریاض جھنگوی اور دیگر علماء کرام کے علاوہ راقم الحروف نے بھی خطاب کیا جس کا خلاصہ نذر قارئین ہے۔

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علیٰ سید المرسلین وعلیٰ الہ واصحابہ واتباعہ اجمعین. اما بعد.

اتحاد اہل سنت پاکستان اور مولانا محمد الیاس گھمن کا شکر گزار ہوں کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کی یاد میں وقتاً فوقتاً اجتماعات منعقد کرتے رہتے ہیں جن میں مجھے بھی حضرت امام ابوحنیفہؒ کی حیات مبارکہ اور علمی ودینی خدمات کے کسی نہ کسی عنوان پر کچھ گزارشات پیش کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ اتحاد اہل سنت کے اسلام آباد کے سیمینار میں حضرت امام اعظم کی سیاسی جدوجہد کے حوالے سے کچھ معروضات پیش کی تھیں، لاہور کے سیمینار میں حضرت امام صاحب کی فقہی خدمات اور قانون سازی کے بارے میں عظیم جدوجہد پر کچھ عرض کیا تھا، جبکہ آج کے اس سیمینار میں ''عقائد اہل سنت کی تعبیر اور وضاحت'' کے بارے میں چند گزارشات کرنا چاہ رہا ہوں۔

امام اعظمؒ عقائد وتعبیرات میں بھی امام ہیں

حضرت امام ابوحنیفہؒ جس طرح فقہ واحکام میں ہمارے امام ہیں اسی طرح عقائد اور ان کی تعبیرات میں بھی انہیں امام کا درجہ حاصل ہے۔ انہوں نے اپنی علمی زندگی کا آغاز عقائد اہل سنت کی وضاحت اور مناظروں سے کیا تھا اور ان کے مختلف مناظروں کا تذکرہ تاریخ وسوانح کی کتابوں میں ملتا ہے۔ مگر اس سے پہلے یہ وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ فقہ کو علم کلام اور دوسرے علوم سے الگ کر کے صرف احکام ومعاملات کے دائرے میں محدود کر دینے کی بات امام صاحبؒ کے دور

میں نہیں تھی، یہ تقسیم بعد میں ہوئی ہے۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ نے فقہ کی جو تعریف بیان فرمائی ہے اس میں احکام ومعاملات کے ساتھ ساتھ عقائد اور اصلاحِ نفس بھی شامل ہے اور اس دور میں عقائد وتعبیرات اور تصوف واخلاق کے مسائل بھی فقہ ہی کے شعبے شمار ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عقائد کے بارے میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کا جو رسالہ معروف ومشہور ہے اس کا نام ''الفقہ الاکبر'' ہے جس کی شرح معروف حنفی محدث و فقیہ حضرت ملا علی قاری نے فرمائی ہے اور جس کا اردو ترجمہ ہمارے چچا محترم حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتیؒ نے کیا تھا جو جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ سے ''البیان الازہر'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے اور اس پر حضرت والد محترم مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ نے تفصیلی پیش لفظ لکھا ہے۔ الفقہ الاکبر کا اطلاق اس دور میں فقہ العقائد پر ہوتا تھا جبکہ علم الاحکام والمعاملات اور وجدانیات یعنی تصوف واخلاق بھی فقہ کے شعبے تھے اور ہمارے تعلیمی نظام کا حصہ سمجھے جاتے تھے۔

فکری واخلاقی تربیت

آج ہمیں دینی مدارس کے ماحول کے بارے میں جن مسائل کا سامنا ہے اور فکری واخلاقی تربیت کے حوالے سے جو خلا محسوس ہو رہا ہے اس کا اب عام طور پر تذکرہ ہونے لگا ہے اور کہا جا رہا ہے کہ دینی مدارس میں تعلیم تو ہوتی ہے مگر تربیت نہیں ہوتی۔ اسے ہمارے محترم بزرگ حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی ان الفاظ کے ساتھ بیان فرماتے ہیں کہ ''ہم اپنے مدارس میں دین پڑھاتے ہیں، سکھاتے نہیں''۔ تربیت کے فقدان میں دونوں باتیں شمار ہوتی ہیں: فکری واعتقادی تربیت اور علمی واخلاقی تربیت۔ ان دونوں کی کمی ہمارے ماحول میں شدت کے ساتھ محسوس کی جا رہی ہے۔ میری طالبعلمانہ رائے میں اس کا حل یہ ہے کہ ہم علوم کی تقسیم سے پہلے کی طرح حضرت امام ابوحنیفہؒ کی طرف سے کی گئی فقہ کی اس تعریف کی طرف واپس چلے جائیں جس میں عقائد اور اصلاح نفس کے مضامین بھی فقہ کا حصہ سمجھے جاتے تھے اور ان دونوں مضامین کو اپنے نصاب کا حصہ بنائیں۔ بالخصوص عقائد کے باب میں جس طرح حضرت امام اعظمؒ نے اپنے دور کے اعتقادی فتنوں اور مسائل کو سامنے رکھ کر متوازن عقائد پیش کیے تھے اسی طرح آج کے اعتقادی فتنوں اور مسائل کو سامنے رکھتے ہوئے متوازن عقائد اپنے طلبہ کو سبقاً سبقاً پڑھائیں اور ان کی دینی واخلاقی

اصلاح کا اہتمام کریں۔ نیز اپنے دور کے فکری، اخلاقی واعتقادی فتنوں سے آگاہی کو تعلیمی نظام میں شامل کریں۔

عقل پرستی اور ظاہر پرستی

حضرت امام ابوحنیفہؒ نے اپنا علمی واستدلالی دائرہ یہ بیان فرمایا ہے کہ وہ کوئی بھی مسئلہ پہلے قرآن کریم سے لیتے ہیں، پھر حدیث وسنت سے رجوع کرتے ہیں، اس کے بعد صحابہ کرامؓ کے اقوال سے استفادہ کرتے ہیں اور صحابہ کرامؓ کے اقوال وآثار سے خروج نہیں کرتے۔ میرے خیال میں یہ دائرہ صرف احکام ومعاملات کی فقہ میں نہیں بلکہ عقائد وکلام اور تصوف واخلاق کا بھی یہی دائرہ ہے۔ اور آج بھی یہی معیار ہے کہ عقائد اور ان کی جو تعبیرات ان تینوں اصولوں کے دائرے میں ہیں وہ صحیح ہیں اور اہل سنت کی ترجمانی کرتی ہیں، اور جو عقائد یا تعبیرات ان سے ہٹ کر ہیں وہ اہل سنت کی تعبیرات نہیں ہیں۔ اسی طرح تصوف وسلوک کے جو طریقے اور روایات ان تینوں اصولوں کے مطابق ہیں وہ درست ہیں، اور جو ان اصولوں سے باہر ہیں ان کا اہل سنت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

حضرت امام اعظمؒ نے جس دور میں عقائد اہل سنت کی تشریح کی ہے اس کا عمومی تناظر یہ تھا کہ معتزلہ، خوارج، روافض اور دیگر اعتقادی فتنے سامنے آچکے تھے اور ایک طرف عقل پرستی جبکہ دوسری طرف ظاہر پرستی نے عام ذہنوں میں ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ حضرت امام صاحبؒ نے ان دونوں کے درمیان توازن واعتدال کی راہ دکھائی اور عقل وقیاس کے صحیح اور معتدل استعمال کے ساتھ نصوص قطعیہ کی بنیادوں کو قائم رکھا۔ انہوں نے بنیاد نصوص پر رکھی اور نصوص میں قرآن کریم، حدیث وسنت اور صحابہ کرامؓ کے آثار وتعامل تینوں کو شامل کیا کہ اہل سنت کا طرۂ امتیاز یہی ہے کہ وہ قرآن کریم اور سنت نبوی کے ساتھ ساتھ آثار صحابہ کرام کو بھی استدلال واستنباط کی بنیاد تسلیم کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ حضرت امام صاحبؒ نے عقل کی نفی نہیں کی اور نہ ہی اس کے جائز استعمال سے گریز کیا ہے، انہوں نے عقل کو استعمال کیا مگر اس کے ہاتھوں استعمال نہیں ہوئے۔ کیونکہ عقل کا صحیح استعمال یہی ہے کہ اس سے استفادہ کیا جائے اور نصوص کے فہم کے لیے استعمال کیا جائے لیکن اسے بنیاد نہ بنایا جائے اور اپنے اوپر مسلط نہ کر لیا جائے۔ یہی حال ظاہر پرستی کا ہے، آیت وحدیث

کے ظاہری مفہوم کو ہی مدار بنایا جائے لیکن اگر کسی آیت یا حدیث کے صحیح فہم کے لیے یا آیات و احادیث کے ظاہری تعارض کو رفع کرنے کے لیے عقل فائدہ دیتی ہے اور اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو اس کی نفی نہ کی جائے بلکہ اس سے استفادہ کیا جائے۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ نے فقہ کے تمام شعبوں میں اسی اعتدال وتوازن کو قائم رکھا ہے اور وحی و عقل کا ایسا حسین امتزاج قائم کیا ہے کہ تیرہ سو سال سے امت اس سے اجتماعی طور پر مستفید ہو رہی ہے۔ وحی اور عقل کے اس متوازن امتزاج کو میں ان الفاظ سے تعبیر کیا کرتا ہوں کہ عقل کو استعمال کیا جائے لیکن اس کے ہاتھوں استعمال نہ ہوا جائے۔ عقل اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے اور انسان کا خاصہ ہے، اللہ تعالیٰ کی اس عظیم نعمت کا مقصد یہی ہے کہ ہم جائز دائروں میں اسے استعمال کریں۔

فقہ حنفی، ایک متوازن فقہ

حضرت امام ابوحنیفہؒ کی اسی خصوصیت و امتیاز کی وجہ سے جہاں اسلامی قانون اور احکام و معاملات میں ان کی فقہ کو عروج حاصل ہوا اور فقہ حنفی نے کم وبیش ایک ہزار برس تک دنیا کے بیشتر اسلامی ممالک میں حکمرانی کی وہاں عقائد کے باب میں بھی امام صاحبؒ کے متوازن ذوق و اسلوب کو ہمیشہ فوقیت حاصل رہی ہے، اس کی دو مثالیں پیش کرنا چاہتا ہوں:

(۱) ایک یہ کہ حنفی فقہ کے معروف ترجمان حضرت امام ابوجعفر طحاویؒ کی کتاب ''العقیدہ الطحاویہ'' کو آج بھی اہل سنت کے عقائد کے سب سے زیادہ مستند مجموعے کے طور پر پڑھایا جاتا ہے۔ حنفیوں کے ہاں تو یہ پڑھایا ہی جاتا ہے، سلفیوں کے مدارس میں بھی یہ کتاب پڑھائی جاتی ہے اور اسے اہل سنت کے عقائد کا صحیح ترجمان سمجھا جاتا ہے۔

(۲) اور دوسری یہ کہ مشرقی ممالک انڈونیشیا اور ملائیشیا وغیرہ میں جہاں امام شافعیؒ کے پیروکاروں کی غالب اکثریت ہے، وہاں عقائد کے باب میں فقیہ ابواللیث سمرقندیؒ کی کتاب ''العقیدہ'' عام طور پر پڑھائی جاتی ہے۔ فقیہ ابواللیث سمرقندیؒ معروف حنفی فقیہ ہیں اور امام طحاویؒ کی طرح احناف کے ترجمان سمجھے جاتے ہیں۔

میرے خیال میں یہ بات اس لیے ہے کہ فقہ واحکام کے ساتھ ساتھ عقائد اور ان کی تعبیرات میں بھی حضرت امام صاحب کی تعلیمات اور فکر وفلسفہ متوازن اور معتدل ہے جس کی بنیاد پر اسلام

کے عقائد واحکام کو سمجھنا آسان ہے اور اس پر عمل کرنا ہر دور کے حالات میں سہل ہے۔

میں عام طور پر علماء کرام اور دینی مدارس کے اساتذہ وطلبہ سے عرض کیا کرتا ہوں کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے حالات زندگی، خدمات، جدوجہد اور علمی و دینی تگ وتاز کے وسیع تر مطالعہ کی ضرورت ہے۔ اور خاص طور پر آج کے عالمی حالات کو سامنے رکھتے ہوئے امت مسلمہ بلکہ نسل انسانی کی ضروریات ومشکلات کے حل کے لیے حضرت امام ابوحنیفہؒ کے افکار وتعلیمات سے استفادہ بہت زیادہ ضروری ہے۔ اس لیے کہ تاریخ کے ایک طالب علم کے طور پر میرا وجدان یہ کہتا ہے کہ امام ابوحنیفہ ماضی کی طرح مستقبل کے بھی بڑے امام ہیں اور ان کی فقہ میں مستقبل کے مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت موجود ہے، خدا کرے کہ ہم وقت کی اس ضرورت کو پورا کرنے میں اپنا کردار ادا کر سکیں۔

محدثین اور فقہاء کا منہجِ عمل اور فقہ حنفی

جناب سرور کائنات حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر اسے اپنی امت کے ساتھ اجتماعی طور پر الوداعی ملاقات قرار دیتے ہوئے مختلف خطبات میں بہت سی ہدایات دی تھیں اور ان ارشادات وہدایات کے بارے میں یہ تلقین فرمائی تھی کہ:

فلیبلغ الشاھد الغائب فرب مبلغ اوعٰی له من سامع.

''جو موجود ہیں، وہ ان باتوں کو ان لوگوں تک پہنچا دیں جو موجود نہیں ہیں۔ بسا اوقات جس کو بات پہنچائی جائے، وہ سننے اور پہنچانے والے سے زیادہ اس بات کی حفاظت کرتا ہے۔''

اس حفاظت کرنے میں یاد رکھنا، سمجھنا، اسے اہتمام کے ساتھ آگے پہنچانا اور صحیح طور پر استعمال میں لانا بھی شامل ہے۔ چنانچہ جب تابعین کرامؒ کے دور میں حدیث وسنت کی حفاظت وروایت اور تفقہ واستنباط کا ایک وسیع سلسلہ سامنے آیا تو حضرت محمد بن سیرینؒ اس کا مشاہدہ وتجربہ کرتے ہوئے بے ساختہ پکار اٹھے: "صدق محمد صلی الله علیه وسلم"، جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فرمایا تھا، وہ آج ایک زندہ سچائی کی صورت میں سب کے سامنے جلوہ گر ہے۔

محدثین اور فقہاء کی محنت

حدیث وسنت کی روایت اور حفاظت وترویج کا محاذ محدثینِ کرام نے سنبھالا اور درایت وتفقہ کا پرچم فقہائے عظام نے بلند کر دیا، جبکہ ان دونوں کی جڑیں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی ان علمی کاوشوں میں پیوست تھیں جن کی نمائندگی کرنے والوں میں حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عبد اللہ بن مسعود، حضرت عثمان، حضرت عبد اللہ بن عمر، حضرت ابو ہریرہ، حضرت انس بن مالک، حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص، حضرت ام المومنین عائشہ اور ام المومنین حضرت ام سلمہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نمایاں ہیں۔

محدثین اور فقہاء کی یہ محنت وکاوش آگے بڑھی تو دائرۂ کار الگ الگ ہونے کی وجہ سے ذوق اور تفہیم واظہار کا امتیاز بھی واضح ہونے لگا، اور رفتہ رفتہ یہ دونوں گروہ مستقل طبقوں کی صورت میں نمایاں ہوتے گئے۔ انسانی ذہن وفہم اور استعداد وصلاحیت کا دائرہ اور سطح کبھی ایک نہیں رہے۔ اسی تنوع واختلاف کے باعث آرا وافکار کا فرق وامتیاز ہمیشہ سے انسانی سوسائٹی میں قائم ہے جو قیامت تک موجود رہے گا۔ اور اگر یہ اپنی حدود میں رہے تو یہی انسانی سوسائٹی کا حسن وامتیاز ہے جو اسے باقی تمام مخلوقات سے ممتاز کرتا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ ''حجۃ اللہ البالغۃ'' میں ارتفاقات یعنی انسانی سوسائٹی کی معاشرتی بنیادوں اور تقاضوں پر بحث کرتے ہوئے ایک جگہ فرماتے ہیں کہ معاشرت اور تمدن کی بنیادی ضروریات پر تو تمام اقوام متفق ہیں، مگر ان کا اظہار ہر طبقہ اپنے اپنے انداز میں کرتا ہے۔ شاہ صاحب کا ارشاد ہے:

والناس بعدها فی تمهید قواعد الآداب مختلفون فالطبیب یمهدها علی استحسانات الطب والمنجم علی خواص النجوم والالهی علی الاحسان کما تجد فی کتبهم مفصلا.

''اصولوں پر اتفاق کے بعد لوگ آداب وضوابط کی تشکیل وتعبیر میں مختلف ہو جاتے ہیں۔ طبیب انہیں طب کی اصطلاحات اور فوائد کی زبان میں بیان کرے گا، نجومی انہی باتوں کا ستاروں کے خواص کے پس منظر میں ذکر کرتا ہے، جبکہ صوفی نے اس کی وضاحت سلوک واحسان کے اسلوب میں کرنا ہوتی ہے، جیسا کہ تمھیں ان کی کتابوں میں اس کی تفصیل ملے گی۔''

محدثین کرام روایت کی نمائندگی فرماتے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ ان کے ہاں ترجیح کی بنیاد روایت کے اصول اور تقاضے ہوں گے، جبکہ فقہاء کرام درایت واستنباط کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں تو وہ تفقہ واستنباط کی ضروریات کو ترجیح دیں گے۔ اس لیے یہاں یہ فرق صرف ذوق واسلوب کا نہیں رہتا بلکہ اپنے اپنے کام کی ضروریات بھی اس کا حصہ بن جاتی ہیں، اور یہی بات امت میں محدثین کرام اور فقہاء عظام کے دو مستقل طبقات کے ظہور وارتقا کا باعث بنی ہے۔

قرونِ اولیٰ میں بہت سے محدثینِ کرام نے حدیث وسنت کی روایت، جمع، حفاظت، رواۃ کی

نقد وجرح اور سند ومتن کی درجہ بندی کے شعبہ میں خدمات سرانجام دیں، جن میں سے صحاح ستہ کے مصنّفین اور امام مالک واحمد رحمہم اللہ تعالیٰ نمایاں ہوکر سامنے آئے اور تمام محدثین کے سرخیل قرار پائے۔ بالخصوص امام بخاریؒ کو سب محدثین کے سردار کے لقب سے نوازا گیا۔ اسی طرح بیسیوں فقہاء کرام نے اپنے اپنے استنباطات واستدلالات کو جمع کیا، اصول وقواعد وضع کیے، ان کے مطابق مسائل واحکام کا استنباط کیا، اور اپنے اپنے علمی حلقے قائم کیے۔ جن میں سے ائمہ اربعہ نے فقہاء کرام کی سیادت وقیادت کا اعزاز حاصل کیا اور امام اعظم ابوحنیفہؒ کی امامتِ عظمیٰ کی فوقیت کو سب نے تسلیم کیا۔

ائمہ اربعہ کی مقبولیت اور فقہ حنفی کا امتیاز

اہلِ سنت کے چاروں ائمہ حضرت امام ابوحنیفہ، حضرت امام مالک، حضرت امام شافعی اور حضرت امام احمد بن حنبل، بلکہ حضرت امام داؤد ظاہری رحمہم اللہ تعالیٰ کی فقہ ودرایت سے بھی امت مسلمہ نے ہر دور میں استفادہ کیا ہے، ان کے مقلدین ومتبعین لاکھوں کی تعداد میں ہمیشہ موجود رہے ہیں اور آج بھی کروڑوں کی تعداد میں موجود ہیں۔ مگر ان میں سب سے زیادہ امتیاز فقہ حنفی کو حاصل ہوا جس کا اعتراف واحترام اہلِ علم وفضل نے ہمیشہ کیا ہے۔ ہمارے خیال میں اس امتیاز و تفوق کے اسباب یہ ہیں:

☆ حنفی فقہ شخصی نہیں، شورائی ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ اور ان کے تلامذہ اپنی اپنی آرا علمی مجلس میں پیش کرتے تھے، ان پر بحث ومباحثہ ہوتا تھا۔ جس بات پر اتفاق ہوتا تھا وہ متفقہ موقف کی صورت میں درج ہوتی تھی۔ مختلف فیہ بات کو اختلاف کے درجہ میں رکھا جاتا تھا، کسی پر جبر نہیں ہوتا تھا۔ اگر مجلس کے کسی شریک کو اجتماعی رائے سے اتفاق نہیں ہوتا تھا تو اس کی رائے الگ درج کی جاتی تھی۔

☆ شورائیت اور اجتماعیت کی یہ روایت فقہ حنفی کی تشکیل وتدوین کے بعد اس پر بوقتِ ضرورت نظر ثانی کے موقع پر بھی قائم رہی۔ چنانچہ مغل دور میں فقہ حنفی کی ازسرِ نو ترتیب وتشریح کی ضرورت پیش آئی تو سلطان اورنگزیب عالمگیرؒ کی سربراہی میں یہ فریضہ سینکڑوں علماء کرام پر مشتمل کونسل نے تفصیلی بحث ومباحثہ کے ذریعے سرانجام دیا۔

جبکہ خلافتِ عثمانیہ کے دور میں فقہ حنفی کی بنیاد پر حالاتِ زمانہ کے مطابق نئی قانون سازی کا مرحلہ پیش آیا تو ''مجلۃ الاحکام العدلیۃ'' کی ترتیب وتدوین فقہاء وعلماء کی ایک مجلس نے مشاورت ومباحثہ کی صورت میں انجام دی۔

☆ فقہ حنفی میں روایت ودرایت کے درمیان فطری توازن کا پوری طرح لحاظ رکھا گیا ہے، اور عقل ودرایت کو نص وروایت پر فوقیت دینے کے بجائے اس کے تابع کیا گیا ہے۔ فقہ حنفی میں نہ تو عقل ودرایت کی ضرورت وافادیت سے انکار کیا گیا ہے، نہ اسے نص و روایت پر ترجیح دی گئی ہے، اور نہ ہی نص وروایت کے فہم واستنباط کو عقل ودرایت کی خدمت ومعاونت سے محروم کیا گیا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ وہ پہلے قرآن کریم سے استنباط کرتے ہیں، پھر حدیث وسنت سے استفادہ کرتے ہیں، اس کے بعد صحابہ کرامؓ سے رجوع کرتے ہیں اور کسی ایک صحابیؓ کا قول بھی مل جائے تو اسے ترجیح دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ احناف کے ہاں ضعیف حدیث کو بھی قیاس پر ترجیح دی جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ احناف عقل ودرایت اور قیاس پر صرف نص کو ہی مقدم نہیں سمجھتے، بلکہ نص کے آخری امکان تک کا لحاظ رکھتے ہیں۔

☆ فقہ حنفی میں عقل ودرایت کا اس کے دائرہ میں بھرپور اور فطری استعمال کیا گیا ہے اور اس سے استفادہ میں کوئی کوتاہی روا نہیں رکھی گئی۔ البتہ احناف کے ہاں نظری اور فلسفیانہ عقلیت کے بجائے عملی اور معاشرتی عقل ودرایت کو احکام وقوانین کی بنیاد بنایا گیا ہے۔ چنانچہ عرف وتعامل کا حنفی فقہ میں اس کی جائز حدود کے اندر پورا احترام کیا گیا ہے اور معاشرتی عقل سے بہت سے احکام ومسائل میں استنباط کیا گیا ہے۔

☆ فقہ حنفی کو طویل عرصہ تک رائج الوقت قانون ونظام کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ خلافتِ عباسیہ، خلافتِ عثمانیہ اور مغل سلطنت میں صدیوں تک عدالتی قانون کے طور پر فقہ حنفی کی عملداری رہی ہے۔ جس کی وجہ سے تجربات ومشاہدات کا جو ذخیرہ اس کے پاس ہے، اور انسانی معاشرہ کی مشکلات کو سمجھنے اور حل کرنے کی جو صلاحیت وتجربہ اس کے دامن میں ہے، وہ (ایک حد تک فقہ مالکی کے سوا) کسی دوسری فقہ کو میسر نہیں آیا۔

فقہ حنفی کے انہی امتیازات وخصوصیات کی وجہ سے بجا طور پر یہ کہا جارہا ہے کہ عالمِ اسلام میں عدالتی اور انتظامی طور پر شرعی احکام وقوانین کے نفاذ کے جو امکانات دن بدن واضح ہوتے جارہے ہیں، ان میں فقہ حنفی ہی نفاذِ اسلام اور تنفیذِ شریعت کی علمی قیادت کی پوزیشن میں ہے۔ اس لیے یہ بات پہلے سے زیادہ ضروری ہوگئی ہے کہ فقہ حنفی کو ماضی کے معاملات وتجربات کے ساتھ ساتھ مستقبل کے امکانات وضروریات کے حوالے سے بھی تحقیق ومطالعہ کا موضوع بنایا جائے، اور انسانی سوسائٹی کی ضروریات ومشکلات کے دائرہ میں فقہ حنفی کی افادیت واہمیت کو علمی اسلوب اور فقہی انداز میں واضح کیا جائے۔

فقہ حنفی کو اس امتیاز وتفوق کے پس منظر میں فطری طور پر کچھ الزامات واعتراضات کا بھی ہر دور میں سامنا رہا ہے جن میں بعض کا تعلق دائرۂ کار اور ذوق واسلوب کے فرق وتنوع سے ہے، بعض اعتراضات نے غلط فہمی کے باعث جنم لیا ہے، کچھ الزامات معاصرت کی پیداوار ہیں، اور ان میں ایسے اعتراضات بھی موجود ہیں جو "حسدًا من عند انفسهم من بعد ما تبين لهم الحق" کا مصداق قرار دیے جاسکتے ہیں۔ ان الزامات واعتراضات کا دفاع مختلف ادوار میں اہلِ علم نے کیا ہے اور صرف احناف نے نہیں، بلکہ منصف مزاج غیر حنفی علماء وافاضل اس دفاع میں پیش پیش رہے ہیں جو یقیناً امامِ اعظمؒ کے خلوص ودیانت اور علم وفضل کی ''خدائی تائید'' ہے۔

فالحمد لله علىٰ ذالك۔

(ماہنامہ دارالعلوم دیوبند۔ اپریل ۲۰۱۶ء)

فقہ حنفی کی امتیازی خصوصیات

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی سید المرسلین وعلی آلہ واصحابہ واتباعہ اجمعین. اما بعد.

اتحادِ اہل سنت پاکستان شکریہ کی مستحق ہے کہ وقتاً فوقتاً حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کی یاد میں ایسی محافل کا انعقاد کرتی رہتی ہے جس کے ذریعہ ہم اپنے اس عظیم محسن کو ایک بار پھر یاد کر لیتے ہیں جو ماضی میں تو ہمارا محسن تھا ہی، ہمارا مستقبل بھی اسی کے انتظار میں ہے۔ گزشتہ بارہ سو سال سے تو اس نے علم وحکمت کی دنیا میں حکمرانی کی ہے، لیکن مستقبل کا فکری تناظر اور علمی تناظر بھی اسی کی طرف دیکھ رہا ہے کہ آنے والے دور کے تقاضے اور آنے والے دور کی ضروریات اسی راستے سے پورے ہوتے دکھائی دیتے ہیں جس راستے سے امام ابوحنیفہؒ نے اس کام کا آغاز کیا تھا۔ ان کا کام جاری ہے اور ان کا کام جاری رہے گا۔ ان کے خدام ہر دور میں علم کی، دین کی، فقہ کی خدمت کرتے آرہے ہیں، آج بھی کر رہے ہیں اور ان شاء اللہ العزیز قیامت تک کرتے رہیں گے۔ مجھے آج گفتگو کے لیے یہ کہا گیا ہے کہ فقہ حنفی کی امتیازی خصوصیات پر میں نے کچھ باتیں آپ سے کہنی ہیں۔ لمبی گفتگو کا موقع نہیں ہے اس لیے مختصراً کچھ عرض کروں گا۔

عالم اسلام کی پہلی مدون فقہ

فقہ حنفی کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ یہ عالم اسلام کی پہلی باقاعدہ فقہ ہے۔ تفقہ رہا ہے، تفقہ کے مختلف دائرے امام صاحب سے پہلے بھی رہے ہیں، لیکن اس تفقہ کی بنیاد پر کسی باقاعدہ فقہ کی تشکیل سب سے پہلے امام صاحبؒ نے کی ہے۔ فقہ حنفی کی اولین امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ یہ عالم اسلام کی پہلی باضابطہ مدون فقہ ہے۔ اس کا اعتراف مورخین نے، محدثین نے کسی حجاب کے بغیر کیا ہے۔ ہمارے علمی ماضی کا ایک حسن یہ بھی ہے کہ ایک دوسرے کے امتیازات کا، ایک دوسرے کی خصوصیات کا اعتراف کرنے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا گیا۔ امام جلال الدین سیوطیؒ

شافعی مسلک کے بزرگ ہیں، بڑے پکے شافعی ہیں،لیکن امام اعظم ابوحنیفہؒ کی عظمت کے اعتراف میں انہوں نے کتاب لکھی ہے جس میں اعتراف کیا ہے کہ أول من دوّن الفقه و رتب أبوابه سب سے پہلا وہ شخص جس نے فقہ کو مدون کیا ہے، اور جس نے فقہ کے ابواب مرتب کیے ہیں، اور جس نے ابواب کے لحاظ سے فقہ مرتب کی ہے، وہ شخص ابوحنیفہ نعمان ابن ثابتؒ ہے۔اپنے اپنے ذوق کی بات ہے، اس عمل کو ہم فقہ بھی کہتے ہیں، تفقہ بھی کہتے ہیں، تدوینِ فقہ بھی کہتے ہیں، لیکن آج کی اصطلاح میں اسے قانون سازی کہتے ہیں۔قانون سازی کسے کہتے ہیں؟ جسے ابتدائی دور میں فقۂ فرضی کہا جاتا تھا اور جس سے بہت سے اہل علم نے بعض تحفظات کے باعث گریز کیا۔ایسے اہل علم صحابہ کرامؓ میں بھی تھے اور تابعین میں بھی جن کو فقۂ فرضی سے تحفظات تھے اور وہ کہا کرتے تھے کہ جب تک کوئی مسئلہ پیش نہ آئے اس کے بارے میں تردد اور تحقیق مت کرو۔جب کوئی معاملہ پیش آجائے تو پھر اس کے بارے میں جستجو کرو۔لیکن تحفظات کا دائرہ الگ ہوتا ہے اور ضروریات کا دائرہ الگ ہوتا ہے۔تحفظات کی دنیا الگ ہوتی ہے کہ اس سے بھی بچنا چاہیے، اس سے بھی گریز کرنا چاہیے، فلاں معاملے میں بھی نہیں پڑنا چاہیے۔لیکن ضروریات درپیش آتی ہیں تو ان کا دائرہ اس سے مختلف ہوتا ہے کہ فلاں ضرورت بھی پوری کرنی ہے اور فلاں ضرورت کے تقاضوں کو بھی ملحوظ رکھنا ہے۔لطف کی بات ہے کہ تحفظات اور ضروریات میں ہر زمانے میں کشمکش رہی ہے۔یہ کشمکش تابعین کے زمانے سے شروع ہوئی ہے، آج بھی ہے اور قیامت تک رہے گی۔تحفظات اور ضروریات دونوں لازمی ہیں۔میں تحفظات اور ضروریات کو گاڑی کے دو پہیوں سے تعبیر کیا کرتا ہوں کہ تحفظات کا دائرہ بھی چھوڑا نہیں جاسکتا اور ضروریات کے دائرے سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا۔ان دونوں کے درمیان توازن قائم کرنے کا نام علم الفقہ ہے۔جس طرح گاڑی کے پہیوں کی وہیل بیلسنگ کی جاتی ہے، معائنہ کر کے ان کے درمیان توازن قائم رکھا جاتا ہے کہ اگر ان کے درمیان یہ بیلنس نہ ہو تو گاڑی کسی ایک طرف کو لڑھکنے لگتی ہے۔میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ امام ابوحنیفہؒ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے فقہ فرضی کو یا قانون سازی کو یا ابھی تک پیش نہ آنے والے مسائل کے پیشگی حل کو، اس طرف ایک ادارے کی شکل میں پیش رفت کی اور دنیا کو بتایا کہ یہ امت کی ضرورت ہے اور ضروریات کو زیادہ دیر تک روکا نہیں جاسکتا۔امام صاحبؒ نے ایسی پیش

رفت کی کہ آج تک عالم اسلام کے فقہ وقانون کی بنیاد اسی پیش رفت پر ہے۔ آج بھی قانون سازی کے لیے جب ضرورت پیش آتی ہے تو ابتداء وہیں سے ہوتی ہے کہ اس معاملے میں زیرو پوائنٹ امام ابوحنیفہؒ کی فقہ ہے۔

یہ فقہ حنفی کا امتیاز ہے کہ قانون سازی کا آغاز بھی فقہ حنفی نے کیا ہے اور دستور سازی کا آغاز بھی فقہ حنفی نے کیا ہے۔ قانون سازی یہ کہ امام ابوحنیفہؒ کی مجلس میں پینتیس سے چالیس کے قریب علماء بیٹھتے تھے جو اپنے اپنے فن کے ماہرین تھے۔ وہ مسائل پر بحث کرتے تھے جس میں اختلاف بھی ہوتا تھا، اتفاق بھی ہوتا تھا اور نتیجے میں ایک قانون تشکیل پاتا تھا۔ لیکن دستور سازی کا آغاز کہاں سے ہوا؟ پہلا باقاعدہ تحریری دستور ہارون الرشید کے کہنے پر امام ابو یوسفؒ نے تحریر کیا۔ حکومتِ وقت نے، امیر المؤمنین ہارون الرشید نے چیف جسٹس، قاضی القضاۃ امام ابو یوسفؒ سے درخواست کی کہ آپ تحریری طور پر مجھے کوئی ایسا ضابطہ مرتب کر دیں جس کے مطابق میں نظام چلاؤں۔ امام ابو یوسفؒ نے اس پر ایک کتاب لکھی جسے ہم ''کتاب الخراج'' کے عنوان سے یاد کرتے ہیں۔ یہ 'الخراج' ملک کا نظام چلانے کا دستور تھا۔ اس میں زیادہ تر معاشیات کے مسائل تھے لیکن یہ اجتماعی طور پر ایک معاشی دستوری ڈھانچہ تھا جو سب سے پہلے خلیفہ ہارون الرشید کے کہنے پر امام ابو یوسفؒ نے لکھا اور یہ دستور نافذ رہا۔ تو میں پہلا امتیاز تو یہ عرض کروں گا کہ عالم اسلام میں قانون سازی کا آغاز فقہ حنفی نے کیا ہے، دستور سازی کا آغاز فقہ حنفی نے کیا ہے۔ پہلا مدوّن قانون امام صاحبؒ اور ان کے شاگردوں نے پیش کیا ہے اور پہلا مدون معاشی دستور بھی امام صاحب کے شاگرد امام ابو یوسفؒ نے پیش کیا۔

شورائی فقہ

فقہ حنفی کی سب سے بڑی اور سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ شورائی فقہ ہے۔ مسئلہ مجلس میں پیش ہوتا تھا، اس پر بحث ومباحثہ ہوتا تھا، اس پر اختلاف یا اتفاق ہوتا تھا، بحث ومباحثے کے بعد ایک نتیجے پر پہنچتے تھے، اگر نتیجے تک پہنچتے تھے تو متفقہ فیصلہ لکھا جاتا تھا اور اگر کسی نتیجے پر نہیں پہنچتے تھے تو اختلافی اراء لکھی جاتی تھیں کہ فلاں کی رائے یہ ہے اور فلاں کی رائے یہ ہے۔ پھر امام محمدؒ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے اس مجلس کے، اس شورائی نظام کے نتائج کو مرتب کیا۔ امام صاحبؒ

کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی شخصی رائے پر فقہ کی بنیاد نہیں رکھی بلکہ اپنی مجلس کی اجتماعی رائے پر رکھی۔ مشاورت، بحث ومباحثہ، مجلس میں بات پیش ہونا، اس کا تجزیہ کرنا، اس کے اتفاق یا اختلاف کے مراحل سے گزرنا، فقہ حنفی کا مزاج یہی ہے، اس کا خمیر اسی پر ہے۔ میں اس پر ایک واقعاتی تناظر پیش کرنا چاہوں گا کہ حنفی فقہ میں اور دوسری فقہوں میں امتیاز کیا ہے۔

حضرت امام مالکؒ ہمارے سروں کے تاج ہیں، امام اہل سنت ہیں، امام دارالھجرہ ہیں، امام مدینہ ہیں، امت کے اساطین میں سے ہیں۔ امام مالکؒ امام ابوحنیفہؒ کے معاصر ہیں۔ امام صاحب مقدم ہیں اور وہ متاخر ہیں لیکن معاصر ہیں۔ فقہ حنفی بھی اسی دور میں وجود میں آئی ہے اور کوئی دس بیس سال کے فرق سے فقہ مالکی بھی اسی دور میں وجود میں آئی ہے۔ فقہ کی ترتیب میں امام صاحب کو تقدم حاصل ہے جبکہ دوسرا نمبر امام مالکؒ کا ہے۔ امام مالکؒ بھی مجلس میں بیٹھتے تھے، سینکڑوں علماء کی مجلس ہوتی تھی، لیکن امام ابوحنیفہؒ کی اور امام مالکؒ کی مجلسوں میں فرق کیا تھا؟ امام مالکؒ کی اپنی ہیبت تھی، اپنا جلال تھا، کسی کو پر مارنے کی جرات نہیں ہوتی تھی اور کوئی مجلس میں چوں بھی نہیں کرسکتا تھا، ان کا اپنا ایک انداز تھا۔ امام مالکؒ تشریف لاتے تھے تو مجلس میں سناٹا طاری ہوجاتا تھا اور کوئی شخص روایت پڑھتا تھا اور اگر امام صاحب کو کوئی تبصرہ کرنا ہوتا تھا تو کرتے تھے اور اگر تبصرہ نہیں کرنا ہوتا تھا خاموش رہتے تھے، کسی کو سوال کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ امام صاحبؒ کی مرضی ہوتی تو وہ وضاحت فرماتے ورنہ اگلی روایت پر چلے جاتے۔ قاضی عیاضؒ نے ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے کہ ایک موقع پر ایک شاگرد کو شوق آ گیا، شاگرد بھی معمولی نہیں تھے، ہشام ابن عمارؒ تھے۔ یہ امام شام تھے، امام دمشق تھے اور اپنے وقت کے بڑے محدث تھے۔ ان کو یہ شوق آیا کہ آج خود پڑھنے کی بجائے استاد سے روایت سننی چاہیے۔ حضرت امام مالکؒ تشریف لائے، بیٹھے، مجلس جمی، حسب معمول کہا کہ پڑھو بھئی، اس دن ہشام کی باری تھی، انہوں نے کہا کہ استاد جی آج آپ پڑھیں۔ امام مالکؒ نے غصے سے کہا اقراء، ہشام نے کہا، استاد جی آج آپ پڑھیں۔ امام صاحبؒ نے پھر فرمایا اقراء، ہشام نے پھر کہا کہ استاد جی آج آپ سے سننے کو جی چاہتا ہے۔ امام مالک کا اپنا ایک مقام تھا، ان کا اپنا ایک ذوق تھا، ساتھ والے شاگرد سے کہا کہ چھڑی پکڑو اور ہشام کی کمر پر پندرہ چھڑیاں مارو۔ اس نے ہشام کی کمر پر پندرہ چھڑیاں ٹکا دیں کہ استاد کا یہی حکم تھا۔ ہشام کھڑے

ہوگئے کہ استاد جی کس جرم کی سزا دی گئی ہے، میں نے صرف یہ کہا تھا کہ آج آپ سے روایت سننے کو جی چاہتا ہے، اس پر آپ نے مجھے پندرہ چھڑیاں مروائی ہے، اچھا ٹھیک ہے، ان چھڑیوں کا حساب کل قیامت کے دن آپ سے لوں گا۔ یہ بہت اچھا زمانہ تھا اور بہت اچھے لوگ تھے۔ بلکہ ''بہت اچھا'' کے الفاظ بھی ان لوگوں کے لیے بہت چھوٹے تھے۔ قیامت کا نام جب سنا تو امام مالکؒ گھبرا گئے، فرمایا کہ ہشام غلطی ہوگئی، معافی دے دو۔ ہشام نے کہا کہ استاد جی کوئی معافی نہیں ہے۔ یہ چھڑی ہوگی، قیامت ہوگی، اللہ کی عدالت ہوگی اور آپ ہوں گے، معافی کس بات کی؟ امام صاحب اور زیادہ گھبرائے کہ یہ تو سیریس کیس ہے۔ فرمایا، بیٹا معافی کی کوئی شکل ہے؟ ہشام نے کہا کہ استاد جی ایک شرط پر معافی مل سکتی ہے، آپ نے پندرہ چھڑیاں مروائی ہیں، اب پندرہ حدیثیں پڑھ کر سنا دیں۔ قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں کہ یہ پہلا موقع تھا کہ امام مالکؒ نے اپنے مزاج کے خلاف ایک شاگرد کو پندرہ حدیثیں سنائیں، اور وہ بھی قیامت کے ڈر سے۔ ایسے موقع پر میں ایک بات عرض کیا کرتا ہوں کہ دیکھیں، اچھے لوگ تھے اور اچھا زمانہ تھا کہ لوگ قیامت کا نام سن کر ڈر جایا کرتے تھے۔ ہم پر قیامتیں بیت جاتی ہیں لیکن ہمارا کچھ نہیں بگڑتا، پھر اسی طرح تروتازہ ہوتے ہیں۔ ہمارے سروں پر سے قیامتیں گزر جاتی ہیں۔

اس واقعہ سے میرا مقصد یہ ہے کہ میں امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کی مجلسوں کے مناظر دکھانا چاہتا تھا کہ ان دونوں کے مزاج میں کیا فرق تھا۔ ایک منظر تو میں نے آپ کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ دوسرا منظر مؤرخین نے لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کی مجلس ہے، مسائل پیش ہو رہے ہیں، بحث ہو رہی ہے، جاحظ مشہور نحوی ہیں، وہ بھی آ کر مجلس میں بیٹھ گئے کہ دیکھتا ہوں کہ یہاں کیا ہوتا ہے۔ انہوں نے دیکھا کہ یہ لوگ تو کھلی بحثیں کر رہے ہیں، ایک دوسرے کا لحاظ ہی نہیں کر رہے۔ اتنے میں کوئی مسئلہ پیش ہوا جس کے متعلق امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا کہ اس بارے میں میری رائے یہ ہے۔ اس پر ایک نوجوان کھڑا ہوا اور کہا أخطأت یا شیخ آپ کی رائے ٹھیک نہیں ہے۔ جاحظ کو یہ بات سن کر بڑا تعجب ہوا کہ ایک لڑکا کس انداز سے مخاطب ہو رہا ہے۔ وہ استاد محترم ہیں، امام ابوحنیفہ ہیں، اور یہ لڑکا ایک بھری مجلس میں کھڑا ہو کر کہہ رہا ہے کہ شیخ آپ کی رائے ٹھیک نہیں ہے۔ امام صاحب تو نوجوان کی بات سن کر مسکرا دیے لیکن جاحظ سے یہ برداشت نہیں ہوا۔ جاحظ نے اٹھ کر کہا

کہ یہ کیا کر رہے ہو آپ لوگ۔ایک لڑکا اٹھ کر کہہ رہا ہے کہ أخطأت یا شیخ۔اس پر امام صاحبؒ نے جاحظ سے کہا کہ بیٹھ جاؤ، نحن عودناھم۔یہ عادت ہم نے ان کو ڈالی ہے۔امام صاحبؒ کی مجلس میں تو یہاں تک ہوتا تھا کہ اگر آخر وقت تک اتفاق نہیں ہوتا تھا تو اختلافی نوٹ لکھوائے جاتے تھے۔اگر کسی مسئلے پر بحث ومباحثہ کے بعد باہمی اتفاق نہیں ہوا تو امام زفرؒ، امام حسنؒ، امام محمدؒ نے اس مسئلے کے تحت اپنی رائے الگ لکھوائی کہ مجلس کا فیصلہ الگ لکھیں اور میری رائے الگ لکھیں۔پھر یہ باقاعدہ لکھا جاتا کہ فلاں مسئلے میں مجلس کی رائے یہ تھی جبکہ امام زفرؒ کی رائے یہ تھی۔فلاں مسئلے میں مجلس کی رائے یہ تھی جبکہ امام حسنؒ کی رائے یہ تھی۔تو میں فقہ حنفی کا دوسرا امتیاز یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ امام ابوحنیفہؒ کی فقہ شخصی نہیں ہے بلکہ شورائی فقہ ہے۔اور 'شورائی' کا جو معنٰی بھی بنتا ہے، ویسی شورائی ہے۔

روایت ودرایت میں توازن

فقہ حنفی کا تیسرا بڑا امتیاز روایت ودرایت میں توازن اور وحی اور عقل سے اپنے اپنے موقع پر صحیح استفادہ ہے۔ہماری بنیاد وحی پر ہے لیکن عقل سے انکار بھی نہیں ہے بلکہ ایک معاون کے طور پر عقل کا صحیح استعمال بھی دین کا تقاضہ ہے جس کا اہتمام احناف کے ہاں سب سے بہتر پایا جاتا ہے۔اُس دور میں اصحابِ ظاہر کی بنیاد محض روایت پر تھی جبکہ معتزلہ نے عقل ودرایت کو معیار قرار دے دیا تھا۔امام صاحبؒ نے اس دور میں جبکہ روایت اور درایت کے جھگڑے کے آغاز ہو رہا تھا اور یہ جھگڑا ایک طوفان بن گیا تھا۔تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میں اپنے جذبات کا اظہار الفاظ میں نہیں کر سکتا کہ ابوحنیفہؒ نے سب سے بڑا کارنامہ یہ کیا کہ روایت اور درایت کے اس طوفانی جھگڑے میں ان دونوں کے درمیان اعتدال وتوازن کا موقف قائم کیا اور اعتدال کے ساتھ روایت اور درایت کا رشتہ جوڑا۔دنیا کو یہ بتایا کہ روایت تو ہماری بنیاد ہے ہی، لیکن درایت بھی ہماری بنیاد ہے۔یہ بات وہی صحیح طور پر سمجھ سکتا ہے جس کی اُس دور کی تاریخ پر نظر ہے کہ روایت اور درایت کے جھگڑے نے کیا طوفان بپا کر دیا تھا۔اسباب کی دنیا میں اگر امام ابوحنیفہؒ روایت اور درایت کے درمیان توازن اور اعتدال کا جھنڈا لے کر نہ کھڑے ہوتے تو خدا جانے یہ طوفان کہاں سے کہاں نکل جاتا۔امام صاحبؒ نے یہ بتایا کہ روایت کا دائرہ یہ ہے اور درایت کا دائرہ یہ ہے۔دونوں آپس

میں لازم وملزوم ہیں۔ روایت کو درایت کے بغیر سمجھنا ممکن نہیں ہے اور درایت بغیر روایت کے گمراہی ہے۔ اس کا خلاصہ عرض کرنا چاہوں گا کہ روایت کو سمجھنے کے لیے درایت ضروری ہے جبکہ نری درایت جو روایت کے بغیر ہو، یہ بالکل گمراہی ہے۔ یہی امام صاحبؒ کی فکر کا خلاصہ ہے کہ انہوں نے روایت و درایت میں امتزاج قائم کیا اور دنیا کو بتایا کہ عقل اور وحی کے درمیان رشتہ کیا ہے۔

فقہ حنفی کے عروج کی وجہ

لوگ کہتے ہیں کہ امام صاحبؒ کی فقہ کو عروج اس لیے حاصل ہوا کہ یہ اقتدار میں تھی۔ یعنی اقتدار فقہ حنفی کی ترقی وعروج کا باعث ہے۔ عباسی دور میں بھی فقہ حنفی حکمران رہی ہے، عثمانی دور میں بھی رہی ہے، ہمارے ہاں مغلوں میں بھی یہی فقہ رائج رہی ہے۔ لیکن میں تاریخ کے ایک طالب علم کے طور پر اس بات سے اتفاق نہیں کرتا کہ فقہ حنفی کو عروج اقتدار کی وجہ سے حاصل ہوا ہے۔ بلکہ فقہ حنفی کو اقتدار اس کی خصوصیات کی وجہ سے حاصل ہوا ہے۔ فقہ حنفی کو اقتدار اس لیے ملا کہ اس کے علاوہ نظامِ حکومت کے لیے کوئی عملی فقہ ہے ہی نہیں۔ نظری بحثیں اور چیز ہیں، علمی مباحث کا دائرہ مختلف ہوتا ہے، لیکن سوسائٹی کے لیے ایک پریکٹیکل سسٹم دینا یہ ابوحنیفہؒ کا کمال ہے۔ معاشرے کی ضروریات کو سمجھنا، نفسیات کو سمجھنا، سماج کو سمجھنا، اس کے دائرے میں، اس کی ضروریات کو سامنے رکھ کر اپنی روایات کے ساتھ تعلق قائم رکھتے ہوئے اس کا حل پیش کرنا یہ فقہ حنفی کا کمال ہے۔ میں کوئی مزید بات کہے بغیر اس پر اپنی بات سمیٹنا چاہوں گا کہ سماج، روایت اور درایت، ان میں امتزاج قائم کرنے کی جو صلاحیت فقہ حنفی میں ہے اور کسی فقہ میں نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے لیے ہمیں محنت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین۔

ہم حنفی کیوں کہلاتے ہیں؟

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی سید المرسلین وعلی آلہ واصحابہ واتباعہ اجمعین. اما بعد.

ہم عقیدہ کے حوالہ سے اہل السنۃ والجماعۃ ہیں، فقہی مذہب کے حوالہ سے حنفی ہیں اور علمی مشرب ومسلک کے حوالہ سے دیوبندی ہیں۔ان میں سے ہر ایک کا اپنا اپنا دائرہ ہے، اپنا اپنا پس منظر ہے اور اپنا اپنا تعارف ہے جو ہم میں سے ہر ایک کے ذہن میں ہونا چاہیے۔حنفی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہم فقہی احکام، فقہی اصول اور فروعات میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کے مقلد ہیں۔یعنی ان کے علم، ثقاہت، دیانت اور فراست پر اعتماد کرتے ہوئے ان کے اقوال وفتاویٰ کو دلائل کی بحث میں پڑے بغیر قبول کرتے ہیں اور دوسرے ائمہ کرامؒ کے اقوال وفتاویٰ پر ترجیح دیتے ہیں۔ہم ایسا کیوں کرتے ہیں؟اس کو سمجھنے کے لیے چند اصولی باتوں کو پہلے سمجھ لینا ضروری ہے۔

اتباع کے لیے نمونہ افراد

پہلی بات یہ ہے کہ قرآن کریم کے اس اسلوب سے ہمیں واقف ہونا چاہیے کہ قرآن کریم میں ہدایت اور راہنمائی کے لیے صرف اصول واحکام اور قوانین وضوابط کی بات نہیں کی گئی بلکہ ان اصول واحکام پر عملدرآمد کے لیے افراد وشخصیات کو بطور نمونہ اور آئیڈیل پیش کیا گیا ہے اور ان کی اقتدا واتباع کا حکم دیا گیا ہے۔چنانچہ سورۃ فاتحہ میں جہاں ہمیں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہر روز اور بار بار صراط مستقیم پر چلائے رکھنے کی دعا کرنے کے لیے کہا گیا ہے وہاں صراط مستقیم کا تعارف اس طرح کرایا گیا ہے:

صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ . (الفاتحہ ۶)

ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا۔

گویا صراط مستقیم کا تعین کرتے وقت ہمارے سامنے صرف راستے کے نشانات ہی نہیں بلکہ اس

پر چلنے والے لوگ بھی ہونے چاہییں اور ہم انہی کو دیکھ کر یہ طے کرسکیں گے کہ صراط مستقیم کون سا ہے؟

ان افراد وطبقات میں سب سے پہلا طبقہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کا ہے جن میں سے چند بزرگوں کا ذکر کر کے سورۃ الانعام کی آیت ۹۰ میں کہا گیا ہے کہ فبھداھم اقتدہ ان کی ہدایت پر چلو اور ان کی پیروی کرو۔ اس طرح ہدایت کا معیار شخصیات کو قرار دیا گیا ہے۔ طبقہ کے حوالہ سے دوسرا طبقہ حضرات صحابہ کرامؓ کا ہے جن کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے اور اسے حق کا معیار بتایا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

> وَاِذَا قِيْلَ لَـهُـمْ اٰمِنُوْا كَمَـآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُـوْٓا اَنُـؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَاۤءُ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاۤءُ وَلٰـكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ. (البقرہ ۱۳)
>
> جب ان (منافقین) سے کہا جاتا ہے کہ وہ اس طرح ایمان لائیں جیسے دوسرے لوگ (صحابہ کرامؓ) ایمان لائے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ کیا ہم ایسے ایمان لائیں جیسے بیوقوف لوگ (معاذ اللہ) ایمان لائے ہیں؟ البتہ وہی لوگ بے وقوف ہیں لیکن وہ جانتے نہیں ہیں۔

یہاں کَمَـآ اٰمَنَ النَّـاس میں ''الناس'' سے مراد صحابہ کرامؓ ہیں اور انہی کو ایمان کے لیے آئیڈیل اور مثال بتایا گیا ہے۔ اسی طرح صحابہ کرامؓ سے خطاب کر کے کہا گیا ہے:

> فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ. (البقرہ ۱۳۷)
>
> پس اگر وہ (دوسرے لوگ) اس طرح ایمان لائیں جیسے تم ایمان لائے ہو تو وہ ہدایت پا گئے اور اگر ہو اس سے پھر گئے تو پختہ بات ہے وہ گمراہی میں ہیں۔

اس آیت کریمہ میں صحابہ کرامؓ کو ایمان کے لیے صرف مثال اور آئیڈیل ہی نہیں کہا گیا بلکہ معیار بھی قرار دیا گیا ہے کہ ان کے طریقے سے پھر جانا گمراہی ہے۔ اسی طرح سورۃ النساء کی آیت ۱۱۵ میں فرمایا گیا ہے کہ

> اور جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرے گا اس کے بعد کہ اس پر

ہدایت واضح ہو چکی اور مومنین کے راستے سے ہٹ کر چلے گا ہم اس کو اسی طرف پھیر دیں گے جدھر وہ پھرے گا اور اس کو جہنم میں داخل کر دیں گے۔

یہاں بھی وَیَتَّبِعۡ غَیۡرَ سَبِیۡلِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ کا اولین مصداق صحابہ کرامؓ ہیں اور ان کے راستے سے ہٹ جانے کو جہنم کے راستے پر چلنے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ پھر سورۃ لقمان میں حضرت لقمان حکیمؒ کی اپنے بیٹے کیلئے وصیت کا ذکر کرتے ہوئے یہ بات فرمائی گئی ہے:

وَاتَّبِعۡ سَبِیۡلَ مَنۡ اَنَابَ اِلَیَّ. (لقمان ۱۵)

اس شخص کی راہ پر چلو جو میرے سامنے جھک گیا ہے۔

ان آیات کریمہ کا حوالہ دینے کا مقصد یہ ہے کہ قرآن کریم نے صرف اصول وضوابط اور احکام وقوانین کی پیروی کا حکم نہیں دیا بلکہ اس کے لیے کچھ طبقات اور افراد کو معیار اور آئیڈیل قرار دے کر ان کی اتباع کی تلقین فرمائی ہے۔

تقلید کے لیے پیشوا کا انتخاب

دوسری اصولی بات جس کی طرف میں توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا ارشاد گرامی ہے جس میں انہوں نے فرمایا کہ جو شخص کسی شخصیت کو اپنا مقتداء اور پیشوا بنانا چاہتا ہے تو اس کے لیے ان لوگوں میں سے انتخاب کرے جو فوت ہو چکے ہیں اس لیے کہ زندہ شخص کسی وقت بھی فتنہ میں مبتلا ہوسکتا ہے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا یہ ارشاد گرامی مشکوٰۃ شریف میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے۔

من کان مستنا فلیستن بمن قدمات فان الحی لا تؤمن علیه الفتنةاولٓئک اَصحاب محمد صلی اللّٰه علیه وسلم کانوا اَفضل هذه الأمة اَبرها قلوبا واعمقها علما وأقلها تکلفا اختارهم اللّٰه لصحبة نبیه ولا قامة دینه فاعرفوا الهم فضلهم واتبعوهم علی اثرهم و تمسکوا بمااستطعتم من اخلاهم وسیر هم فانهم کانوا علی الهدی المستقیم.

جو شخص کسی کی پیروی کرنا چاہتا ہے تو ان کی کرے جو فوت ہو چکے ہیں اس لیے کہ زندہ آدمی فتنہ سے محفوظ نہیں ہے اور وہ لوگ اصحاب محمدؐ ہیں جو سب سے زیادہ نیک دل تھے، سب سے زیادہ گہرے علم والے تھے اور سب سے کم

تکلف والے تھے، انہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی صحبت اور اپنے دین کی اقامت کے لیے چنا تھا پس ان کے فضل کو پہچانو، اور ان کے نقش قدم پر چلو اور جہاں تک تمہارے بس میں ہو ان کے اخلاق و عادات کو مضبوطی سے تھام لو کیونکہ وہی لوگ سیدھے راستے پر ہیں۔

ان ارشادات کی روشنی میں عرض کرتا ہوں کہ طبقات کے حوالہ سے حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اور حضرات صحابہ کرامؓ واجب الاتباع ہیں اور ہم اسی وجہ سے اہل السنۃ والجماعۃ کہلاتے ہیں کہ جناب نبی اکرمؐ کی سنت اور حضرات صحابہ کرامؓ کی جماعت ہماری علمی اور فکری اساس ہیں۔

حضرات صحابہ کرامؓ کے بعد اتباع واقتداء اور فالو کرنے کے لیے شخصیات کا چناؤ اس بنیاد پر ہو گا کہ کس کے پاس دین کا علم زیادہ ہے، کون دینی تفقہ کی دولت سے مالا مال ہے اور کس کے تقوٰی و دیانت پر امت کو زیادہ اعتماد ہے۔ یہاں میں جناب نبی اکرمؐ کا ایک ارشاد گرامی پیش کرنا چاہوں گا جو مسند دارمی میں حضرت جبیر بن معطمؓ سے روایت ہے کہ جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا کہ

نضر اللّٰہ عبدا سمع مقالتی فوعاھا ثم اداھا الی من لم یسمعھا فرب حامل فقہ لافقہ لہ ورب حامل فقہ الی من ھو افقہ منہ.

اللہ تعالیٰ اس شخص کو تر و تازہ رکھے جس نے میری بات سنی اسے یاد رکھا اور پھر اسے آگے ایسے شخص تک پہنچا دیا جس نے اسے نہیں سنا اس لیے کہ بعض سننے والے ایسے ہوتے ہیں جنہیں اس کی سمجھ نہیں ہوتی اور بعض سننے والے اسے خود سے زیادہ سمجھنے والے تک پہنچا دیتے ہیں۔

اس ارشاد نبوی کی روشنی میں دو باتیں عرض کرنا چاہوں گا۔ ایک یہ کہ حدیث اور چیز ہے اور فقہ اس سے مختلف چیز ہے اور دونوں دین کا مطلوب ہیں۔ قرآن کریم بھی لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّيْنِ کے تحت اس کی اہمیت بیان کرتا ہے اور جناب نبی اکرمؐ نے بھی ایک اور حدیث میں فرمایا ہے کہ جس شخص کے ساتھ اللہ تعالیٰ خیر کا ارادہ فرماتے ہیں یفقھہ فی الدین اسے دین کی سمجھ عطا فرما دیتے ہیں۔

حدیث محض سننے، یاد کرنے اور آگے پہنچا دینے سے پوری ہو جاتی ہے لیکن اسے سمجھنے کے لیے عقل درکار ہے، درایت کی ضرورت اور دانش مطلوب ہے۔ اس عقل و دانش کے درجات مختلف

ہیں جن میں سے ''اَفقہ منہ'' کی تلاش دینی ضروریات میں سے ہے۔اس لیے ہمارا طریق کار یہ ہے کہ ہم خالی روایت پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اس کے بعد تفقہ کی ناگزیر ضرورت کی طرف بھی توجہ دیتے ہیں اور حدیث وفقہ کے امتزاج کو اپنے فقہی مذہب کی اساس سمجھتے ہیں۔

یہاں ایک بات اور عرض کرنا چاہوں گا کہ خالی روایت حدیث کہلاتی ہے اس کے ساتھ درایت اور تفقہ شامل ہو جائے تو اس سے سنت مستنبط ہوتی ہے۔اور جناب نبی اکرمؐ نے ''سنت'' کو واجب الاتباع قرار دیا ہے جو حدیث وفقہ کے امتزاج سے وجود میں آتی ہے اور یہی اہل السنۃ والجماعۃ کی بنیاد ہے۔

اتباع کے لیے امام ابوحنیفہؒ ہی کیوں؟

صحابہ کرامؓ کے بعد فقہاء کرامؒ کی پیروی کی بات تو سمجھ میں آتی ہے مگر فقہاء کرامؒ کی اتنی بڑی جماعت میں سے ہم نے امام ابوحنیفہؒ کا انتخاب کیوں کیا ہے؟ میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کی ترجیح کی وجوہ میں دو تین باتوں کی طرف توجہ دلاؤں گا۔پہلی بات وہی کہ حدیث نبوی میں من ھوا فقہ منہ فرمایا گیا ہے اور حضرات فقہاء کرامؒ میں سے حضرت امام ابوحنیفہؒ کا ''اَفقہ'' ہونا ایک ایسی متفقہ علیہ بات ہے جس کے لیے کسی دلیل کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ان کے بارے میں حضرت امام شافعیؒ کا ارشاد گرامی ہے،

من اراد الفقہ فھو عیال علی ابی حنیفۃ۔

جو شخص بھی فقہ حاصل کرنا چاہتا ہے وہ ابوحنیفہؒ کے سامنے بچوں کی طرح ہے۔

اور حضرت عبداللہ بن مبارکؒ فرماتے ہیں کہ اَفقہ الناس ابو حنیفۃ اور وما ریت فی الفقہ مثلہ لوگوں میں سے بڑے فقیہ ابوحنیفہؒ ہیں اور میں نے فقہ میں ان جیسا کوئی نہیں دیکھا۔

عقل کا جائز مقام

ہماری دوسری وجہ ترجیح یہ ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ نے عقل وقیاس کو اس کے صحیح مقام پر رکھا ہے، نہ اس سے انکار کیا ہے اور نہ ہی اتنا سر چڑھا دیا ہے کہ نصوص پر حکومت کرنے لگے۔عقل اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے جس کے استعمال سے گریز اس نعمت کی ناشکری ہے اور اس کی حدود متعین ہیں جن سے آگے اس کو بڑھانا جائز نہیں ہے۔اس بارے میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کی ترتیب ملاحظہ

فرمایئے کہ وہ دلیل میں سب سے پہلا درجہ قرآن کریم کو دیتے ہیں، اس کے بعد حدیث نبوی کو۔ حدیث نبوی کے بارے میں ان کا ارشاد گرامی ہے کہ اگر ضعیف حدیث بھی موجود ہو تو وہ اسکے مقابلہ میں قیاس نہیں کریں گے اور حدیث کو ترجیح دیں گے۔ بلکہ وہ تو صحابہ کرامؓ کے اقوال کو بھی قیاس سے مقدم رکھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ کے کسی مسئلہ میں اقوال مختلف بھی ہوں تو وہ انہی میں سے ایک کا انتخاب کریں گے اور صحابہؓ کے اقوال سے باہر نہیں نکلیں گے۔ گویا وہ صحابی کے قول کو بھی قیاس پر مقدم قرار دیتے ہیں اور وہ قیاس کا درجہ صحابہ کرامؓ کے اقوال کے بعد تسلیم کرتے ہیں۔

عقل کا صحیح مقام بھی یہی ہے کہ وہ نصوص کی تفہیم اور استنباط واستدلال میں معاون ہے۔ عقل نصوص کے درجات ختم ہو جانے کے بعد اس پوزیشن میں آتی ہے کہ اسے کسی فیصلے یا حکم کی بنیاد بنایا جائے۔ اس لیے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ نے وحی اور عقل کے درمیان حقیقی توازن قائم کیا ہے اور ان کی فقہ کی مقبولیت کا ایک اہم سبب یہ بھی ہے۔

شورائی فقہ

ہماری تیسری وجہ ترجیح یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کی فقہ شخصی نہیں بلکہ شورائی ہے۔ امام صاحبؒ کی فقہ کی بنیاد کسی ایک شخصیت کے استدلال واستنباط پر نہیں بلکہ پورے ایک شورائی نظام پر ہے جس میں فقہاء کرام کی ایک بڑی جماعت نے اجتماعی غور وخوض اور بحث ومباحثہ کے بعد ہزاروں مسائل مستنبط کیے ہیں۔ ان ہزاروں مسائل میں ایک بڑی تعداد ان مسائل واحکام کی ہے جن میں ہم امام ابوحنیفہؒ کی بجائے ان کی مجلس مشاورت کے دوسرے شرکاء کے اقوال کو قبول کرتے ہیں۔ اس بناء پر مجھے ان حضرات کی بات سے اتفاق نہیں ہے جو احناف کو تقلیدِ شخصی کا طعنہ دیتے ہیں۔ مجھے تقلید شخصی سے بھی انکار نہیں ہے، کیونکہ دیگر فقہی مذاہب مثلاً مالکیہ، شوافع اور حنابلہ کی بنیاد تقلیدِ شخصی پر ہی ہے لیکن احناف کے بارے میں یہ بات قبول کرنے میں مجھے تامل ہے۔ اس لیے کہ ہمارے پورے فقہی نظام کی بنیاد صرف حضرت امام ابوحنیفہؒ کے اقوال وفتاویٰ پر نہیں بلکہ ان کے ساتھ شریک دوسرے فقہاء کرام کے اقوال وفتاویٰ بھی ہمارے فقہی احکام کی بنیاد ہیں۔ فقہ حنفی اجتماعی ہے اور شورائی ہے جس میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کو اس شورائی نظام کے سربراہ اور علمی وفکری راہ نما

کی حیثیت حاصل ہے اور اسی وجہ سے یہ فقہ ان کی طرف منسوب ہے لیکن عملی طور پر یہ فقہ شخصی نہیں ہے اجتماعی ہے۔

قابلِ عمل فقہ

ہماری چوتھی وجہ ترجیح یہ ہے کہ فقہ حنفی عملی اور پریکٹیکل ہے اور اسے اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں قبولیت عطا فرمائی ہے۔ خلافت عباسیہ میں اسے ملکی قانون کا درجہ حاصل رہا ہے اور خلافت عثمانیہ میں بھی یہی ملک کا عام قانون تھی۔ اسی طرح مغل حکمرانوں کے دور میں جنوبی ایشیا میں بھی اسے قانون و دستور کی حیثیت حاصل تھی۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ یہ فقہ متوازن ہے، قابل عمل ہے اور سوسائٹی کی ضروریات کا لحاظ رکھتی ہے۔

حضرات محترم!

میں نے اصولی طور پر چند اشارات میں یہ بات عرض کی ہے کہ ہم حنفی کیوں کہلاتے ہیں اور فقہی احکام ومسائل میں حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور ان کی جماعت ورفقاء کو ترجیح کیوں دیتے ہیں ؟ اللہ تعالیٰ ہم سب کو صحیح باتوں پر عمل کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

فقہ حنفی اور اس کی مقبولیت

یکم مارچ ۲۰۱۴ء کو مارگلا ٹاؤن اسلام آباد میں مسجد نمرہ کے خطیب مولانا محمد ادریس ڈیروی کی دعوت پر ایک کتاب کی تعارفی تقریب میں شرکت کا موقع ملا جو وسطی ایشیا میں فقہ حنفی کے ارتقا کے موضوع پر اہم علمی کاوش ہے۔کتاب کے مصنف پروفیسر ڈاکٹر رفیع الدین احمد کا تعلق کوٹ ادو سے ہے اور وہ ایک عرصہ سے میرپور آزاد کشمیر میں تدریسی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔انہوں نے جامعہ مظاہر العلوم کوٹ ادو میں طالب علمی کا ایک دور گزارا ہے جبکہ اپنے علمی وتحقیقی ذوق میں وہ کراچی کے دو ممتاز اصحابِ علم مولانا محمد طاسین رحمہ اللہ تعالیٰ اور ڈاکٹر نثار احمد کے خوشہ چین ہیں۔ انہوں نے جامعہ کراچی میں ڈاکٹر نثار احمد صاحب کی نگرانی میں ڈاکٹریٹ کے مقالہ کے طور پر یہ تحقیقی خدمت سرانجام دی ہے جو چھ سو سے زائد صفحات پر مشتمل ضخیم کتاب کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔اس میں انہوں نے فقہ حنفی کے امتیازات وخصوصیات کے ساتھ ساتھ چوتھی اور پانچویں صدی کے دوران وسطی ایشیا میں فقہ حنفی کے ارتقا اور اس دور کے اس علاقہ کے ممتاز حنفی فقہاء کا تذکرہ کیا ہے اور فقہ حنفی کی قبولیت کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے۔تعارفی تقریب میں آزاد کشمیر کے بزرگ عالم دین حضرت مولانا محمد اسحاق خان المدنی اور علامہ اقبالؒ اوپن یونیورسٹی اسلام آباد کے صاحبِ علم وفضل استاذ جناب ڈاکٹر علی اصغر چشتی بھی شریک تھے اور ان کے زرّیں خیالات سننے کا موقع ملا۔راقم الحروف نے اس موقع پر جو معروضات پیش کیں ان کا خلاصہ نذرِ قارئین ہے۔

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی سید المرسلین وعلی آلہ واصحابہ واتباعہ اجمعین. اما بعد.

فقہ حنفی نے عالم اسلام میں طویل عرصہ تک حکومت کی ہے اور وہ عباسی خلافت اور عثمانی خلافت کے علاوہ جنوبی ایشیا میں مغل حکومت کا بھی مدّتوں قانون ودستور رہی ہے۔امام اعظم حضرت امام

ابوحنیفہؒ کو اللہ رب العزت نے یہ اعزاز بخشا ہے کہ ان کی علمی وفقہی کاوشوں کو امت مسلمہ میں سب سے زیادہ قبولیت حاصل ہوئی ہے۔ اور صدیوں تک کئی حکومتوں کا دستور وقانون رہنے کے ساتھ ساتھ عام مسلمانوں میں بھی اس کے پیروکاروں کی ہمیشہ اکثریت رہی ہے جو آج بھی اپنا تسلسل قائم رکھے ہوئے ہے اور امت کی بہت بڑی اکثریت فقہی احکام ومسائل میں فقہ حنفی پر عمل کو ترجیح دیتی ہے۔

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ فقہ حنفی کی مقبولیت کا سبب یہ تھا کہ حضرت امام ابو یوسفؒ نے عباسی خلافت میں قاضی القضاۃ کا منصب قبول کر لیا تھا اور انہیں اپنی اس حیثیت کو فقہ حنفی کے فروغ کا ذریعہ بنانے کا موقع ملا۔ بادی النظر میں یہ بات شاید درست بھی لگتی ہے لیکن تاریخ کے ایک طالب علم کے طور پر میری رائے یہ ہے کہ حکومت واقتدار فقہ حنفی کے فروغ ومقبولیت کا ذریعہ نہیں بنا بلکہ فقہ حنفی کی مقبولیت اس کے اقتدار تک پہنچنے کا سبب بنی ہے۔ ہمارے فاضل دوست ڈاکٹر رفیع الدین احمد صدیقی نے اس کتاب میں ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ خلیفہ مامون الرشید کے وزیر اعظم فضیل بن سہل کے پاس باقاعدہ طور پر ایک درخواست پیش کی گئی کہ فقہ حنفی کو خلافت کا دستور وقانون کے طور پر نافذ کرنے کا حکم منسوخ کیا جائے۔ جس پر وزیر اعظم نے اپنے رفقاء اور دیگر ذمہ دار حضرات سے مشاورت کی۔ انہیں بتایا گیا کہ فقہ حنفی کو بطور قانون ختم کرنے کا عوامی ردعمل بہت شدید ہوگا جس کا سامنا کرنا آپ لوگوں کے لیے مشکل ہو جائے گا۔ چنانچہ مختلف حضرات سے اس مشاورت کے بعد مامون الرشید کے وزیر اعظم نے فقہ حنفی کے خلاف یہ درخواست قبول کرنے سے معذرت کر لی۔ یہ واقعہ ہمارے اس موقف کی تائید کرتا ہے کہ اقتدار فقہ حنفی کے فروغ کا سبب نہیں بنا بلکہ فقہ حنفی کا فروغ اور اس کی عوامی مقبولیت اس کے حکومتی قانون بننے کا ذریعہ ثابت ہوئی ہے۔

میں اس موقع پر یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ فقہ حنفی کے فروغ ومقبولیت کے میری طالب علمانہ رائے میں تین بڑے سبب تھے:

(۱) ایک یہ کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ اور ان کے رفقاء کار نے امت مسلمہ کی ضروریات کو محسوس کر کے اس کے مطابق قانون سازی کا اہتمام کیا تھا اور قرآن وسنت کی روشنی میں زمانے کی ضروریات کے لحاظ سے یہ پہلی باقاعدہ قانون سازی تھی جس نے نہ صرف

اس دور کی ضروریات کو پورا کیا بلکہ قیامت تک امت مسلمہ اس سے راہ نمائی حاصل کرتی رہے گی۔حضرت امام ابوحنیفہؒ نے اپنے تلامذہ اور رفقاء کی معیت میں لاکھوں مسائل مرتب کیے اور زندگی کے کسی گوشے کو مرتب شدہ قوانین سے خالی نہیں رہنے دیا۔جبکہ حضرت امام ابو یوسفؒ نے خلیفہ ہارون الرشیدؒ کی فرمائش پر ''کتاب الخراج'' کے نام سے سلطنت کا پہلا دستور تحریر کیا جو باقاعدہ نافذ ہوا۔''کتاب الخراج'' اپنے عنوان کے اعتبار سے اگرچہ مالیات سے تعلق رکھتی ہے لیکن اس میں قومی زندگی کے دیگر شعبوں مثلاً انتظام وسیاست، حاکم ورعیت کے باہمی حقوق ومعاملات اور غیر مسلم اقلیتوں کے حقوق کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔اس لیے وہ اس دور کے حوالہ سے ایک مکمل دستور کی حیثیت رکھتی ہے جو عباسی خلافت کا دستور مملکت رہی ہے۔

(۲) فقہ حنفی کی مقبولیت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ شخصی فقہ نہیں بلکہ مشاورتی اور اجتماعی فقہ ہے۔مسائل پر غور کرنے کے لیے حضرت امام ابوحنیفہؒ کے ساتھ سرکردہ علماء کرام اور فقہاء کی مجلس ہوتی تھی جس میں مسائل پیش کیے جاتے تھے۔ان پر باقاعدہ بحث و مباحثہ ہوتا تھا اور اختلاف رائے کا حق دیا جاتا تھا۔حتیٰ کہ اگر کسی کا مجلس کے عمومی موقف سے اتفاق نہیں ہوتا تھا تو اس کی رائے الگ طور پر درج کی جاتی تھی۔

(۳) جبکہ فقہ حنفی کی مقبولیت کی تیسری وجہ یہ ہے کہ اس میں عقل ودانش کا متوازن استعمال کیا گیا ہے اور وحی وعقل کے درمیان فطری توازن کو قائم رکھتے ہوئے عقل وقیاس سے بھرپور استفادہ کیا گیا ہے۔عقل اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت ہے۔اسے اگر وحی کی راہ نمائی میں حدود کے اندر استعمال کیا جائے تو یہ اس کی قدردانی اور شکرگزاری ہے،جس کا فقہ حنفی میں پوری طرح اہتمام کیا گیا ہے اور اسی وجہ سے زیادہ تر اصحاب عقل ودانش کی ترجیح ہمیشہ فقہ حنفی رہی ہے۔

ڈاکٹر رفیع الدین احمد صدیقی نے اپنے اس مقالہ میں فقہ حنفی کے تعارف اور وسطی ایشیا میں اس کے ارتقا پر جو تحقیقی کام کیا ہے وہ میرے نزدیک نہ صرف ماضی کے حوالہ سے ایک اہم علمی خدمت ہے بلکہ ملت اسلامیہ کے مستقبل کے حوالہ سے بھی ایک بڑی ضرورت کی حیثیت رکھتی ہے۔اس

لیے کہ عالم اسلام میں ایک بار پھر شرعی احکام وقوانین کے نفاذ وفروغ کے جو امکانات دکھائی دے رہے ہیں ان کا تقاضہ ہے کہ فقہ حنفی کے اصولوں اور خدمات کو اجاگر کیا جائے۔ اس لیے کہ فقہ حنفی کی یہ خصوصیات مثلاً:

(۱) زمانے کی ضروریات کو محسوس کرتے ہوئے ان کے لیے مناسب قانون سازی۔

(۲) فقہی وشرعی احکام میں اجتماعیت، مشاورت اور باہمی بحث مباحثہ کا اہتمام۔

(۳) عقل وقیاس، خاص طور پر کامن سینس کا قرآن وسنت کی حدود میں مناسب استعمال۔

ماضی کی طرح ہمارے آج اور مستقبل کی بھی اہم ضروریات ہیں اور انہیں فقہ حنفی ہی زیادہ بہتر طور پر پورا کرسکتی ہے۔ اس لیے میں ڈاکٹر رفیع الدین احمد صدیقی کو اس علمی کاوش پر مبارک باد دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کی قبولیت کے لیے دعا گو ہوں، آمین یارب العالمین۔